جامعہ حقانیہ کا ترجمان

مجلّہ

الحقانیہ

ساہیوال
سرگودھا

جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ اپریل ۲۰۱۱ء

بانی: فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی قدس سرہٗ

فہرست



کلمۃ الحق شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی

مصائب وحوادث کا علاج

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کی دو نادر تحریریں

مرشدی وسندی حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ وبرد اللہ مضجعہ کے دو مضمون اب سے تقریباً ۵۴ سال قبل رسالہ الامداد (تھانہ بھون ضلع مظفر نگر) میں زیر عنوان ''الاحکام'' ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۴ھ وجمادی الاخریٰ ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوئے تھے ان کا بنیادی موضوع بھی یہی تھا، ذیل میں یہ دو تحریریں افادۂ عوام کے لیے حاضر ہیں، امید ہے کہ ہم سب کے لیے سامان عبرت ہوں گی (شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی)

آج کل ہر طرف آلام ومصائب اور افکار وحوادث کا ہجوم ہے، مفلس اور متمول، مزدور اور سرمایہ دار، جاہل اور عالم، مریض اور تندرست، محکوم اور حاکم، عوام اور خواص سب ہی ان سے متاثر ہیں اور سکون قلب اور طمانیت خاطر کسی کو بھی نصیب نہیں (الا ماشاء اللہ) ہر شخص کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے، پریشانی کی نوعیت مختلف ہے، کوئی تنگ دستی اور افلاس کا شکار ہے، کسی کی صحت خراب ہے، کوئی اولاد کی نالائقی اور بداطواری سے پریشان ہے، کسی کو بیوی کے ناروا طرز عمل کی شکایت ہے، کوئی شوہر کی بدسلوکی سے نالاں ہے، کسی کو اقارب واحباب کے نامناسب برتاؤ کا شکوہ ہے اور کسی کو کوئی دوسری فکر اور پریشانی لاحق ہے، غرض یہ ہے کہ ۔

آماجگاہ موج حوادث ہے آج کل پتلا بنا ہوا ہے غم روزگار کا

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصائب وحوادث سے کس طرح نجات ملے؟ اور سکون قلب کیسے حاصل ہو؟ اس سوال کا جواب دینے سے قبل یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ نزول حوادث ومصائب کا سبب کیا ہے؟ تا کہ اس کو دور کیا جا سکے، اس لیے کہ جب سبب دور ہو جائے گا تو مصائب اور حوادث سے خود بخود نجات مل جائے گی ۔ یوں تو ہمارے بہت سے اصحاب فکر ونظر اور ارباب حل وعقد بھی اپنے اپنے علم وفکر کے مطابق آئے دن ان تدابیر کے متعلق غور کرتے رہتے ہیں جن پر عمل کرنے سے بھی بنی نوع انسان کو پریشانیوں اور تکلیفوں سے نجات ملے اور فلاح وعافیت نصیب ہو، لیکن کیا وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہیں؟ نہیں، اور یقیناً نہیں، وجہ یہ

ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اصل مرض کی تشخیص اور ازالۂ مرض کی تجویز میں ٹھوکر کھائی، ان کی نظر صرف اسباب طبعیہ تک محدود رہتی ہے، اسباب اصلیہ تک نہیں پہنچتی، مثلاً ان کا خیال ہے کہ اگر اولاد کی پیدائش پر پابندی عائد کر کے آبادی کے اضافے کو روک دیا جائے، زراعت کے جدید آلات استعمال کر کے اور کاشتکاری کے نئے نئے طریقے (جو ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہیں) اختیار کر کے مزروعہ زمین کی پیداوار بڑھائی جائے، صنعت وحرفت کی ترقی اور بے روزگاری کے دور کرنے کے لیے نئے نئے کارخانے قائم کر لیے جائیں، سیلاب کو روکنے کے لیے بڑے بڑے مضبوط اور پختہ بند تعمیر کر لیے جائیں، حوادث ارضی کی روک تھام کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کر لی جائیں، جرائم کے انسداد کے لیے سخت اور مؤثر قدم اٹھائے جائیں، تعلیم کی کمی اور بے روزگاری کو دور کر دیا جائے، علاج کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کر دی جائیں.....تو موجودہ تکالیف کا سدباب اور زندگی کا معیار بلند ہو جائے گا اور انسان خوشحال اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرنے لگے گا ان تدابیر میں سے پہلی کے سوا اکثر وہ ہیں جو اسلامی شریعت کے نقطۂ نظر سے جائز اور مستحسن ہیں اور انہیں ضرور اختیار کرنا چاہیے لیکن یہاں ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے اور وہ یہ کہ یہ تمام تدبیریں ظاہری اور مادی ہیں اور مسلمان کے نقطۂ نظر سے ہرگز کافی نہیں، قرآن وحدیث نے ہمیں اپنے مصائب اور مشکلات دور کرنے کا کچھ اور طریقہ بھی بتلایا ہے، افسوس ہے کہ مسئلے کا یہ پہلو ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے، ان مادی وسائل کے اختیار کرنے کو کون منع کرتا ہے؟ اختیار کیجیے اور ضرور کیجیے، لیکن یہ یاد رکھیے کہ صرف یہ وسائل اصل سبب کے ازالہ کے لیے کافی نہیں۔ نزول حوادث ومصائب کا سبب معلوم کرنے کے لیے جب ہم قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو حسب ذیل آیات ہمارے سامنے آتی ہیں:

ظهر الفساد في البر والبحر بما كسبت ايدي الناس ليذيقهم بعض الذي عملوا لعلهم يرجعون (خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھا دے تا کہ وہ باز آ جائیں) لیکن کیا ہم اپنی بداعمالیوں سے باز آ رہے ہیں؟ پھر جب سبب دور نہ ہو تو مسبب کیسے دور ہو سکتا ہے۔

وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر (اور تم کو جو مصیبت پیش آتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں سے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے اور بہت سے گناہ تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں) اللہ اللہ یہ سزا تو ہمارے بعض اعمال کی ہے اور بہت سی خطاؤں کو تو وہ معاف ہی فرماتے رہتے ہیں، اگر سارے گناہوں پر گرفت ہوا کرتی تو کہاں ٹھکانا تھا، چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں: ولو یؤاخذ اللّٰہ الناس بما کسبوا ماترک علی ظھرھا من دابۃ ولکن یؤخرھم الی اجل مسمی فاذا جاء اجلھم فان اللّٰہ کان بعبادہ بصیرا (اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے اعمال کے سبب دارو گیر اور مواخذہ فرمانے لگتے تو روئے زمین پر ایک متنفس کو نہ چھوڑتے، لیکن وہ ایک میعاد معین تک مہلت دے رہے ہیں، سو جب ان کی وہ میعاد آپہنچے گی اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لیں گے) لہٰذا ہم کو اس کا علاج کرنا چاہیے اور وہ علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال سیئہ کو حسنات سے بدلا جائے اور گذشتہ گناہوں سے استغفار کیا جائے، واللہ اس کے سوا ان بلاؤں کا کوئی علاج نہیں۔

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(خلوت گاہ حق یعنی تعلق مع اللہ کے سوا کہیں آرام نہیں)

کاش ہماری سمجھ میں یہ بات آجائے کہ یہ بلائیں ہمارے گناہوں کی وجہ سے آ رہی ہیں اور ان کا علاج تو بہ واستغفار، ترک معاصی اور دعا ہے۔

قرآن وحدیث میں مصائب کا جو اصل سبب اور ان کے ازالہ کی جو صحیح تدبیر بیان کی گئی ہے اس سے صرف نظر اور روگردانی کر کے عقلاء زمانہ اصلاح حال کے لیے کتنی ہی اور کیسی ہی کوشش کیوں نہ کر لیں راقم السطور کی یہ پیشین گوئی نوٹ کر لی جائے کہ ہرگز کامیاب نہ ہوں گے، مرض کی تشخیص صحیح نہ ہو تو علاج کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور عازم کعبہ اگر ترکستان کی طرف جانے والے راستہ پر چلنے لگے تو یہ یقین غلط نہیں کہ وہ منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے گا بلکہ اس سے بعید تر ہوتا چلا جائے گا، چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ جو غلط تدابیر اب تک اختیار کی گئیں ان کا انجام یہی ہوا کہ اصلاح کی جگہ فساد بڑھتا رہا اور حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

جب انسان صراط مستقیم سے بھٹک جائے اور عقل سے صحیح طور پر کام نہ لے تو اس کی رائے بھی غلط ہوگی اور عمل بھی، اس کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں، مثلاً اگر کسی علاقے میں سیلاب یا طوفان آجائے تو قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا صحیح علاج تو یہ ہے کہ جائز ظاہری ومادی وسائل کو اختیار کرنے کے علاوہ ہم گذشتہ گناہوں سے استغفار کریں، جو گناہ کررہے ہیں ان کو ترک کردیں اور آئندہ کے لیے گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلیں اور اللہ تعالیٰ سے نہایت عاجزی اور تضرع وزاری کے ساتھ ازالۂ مصائب کے لیے دعا کریں اور اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی جائز اور بقدر وسعت وگنجائش زیادہ سے زیادہ مدد کریں، لیکن جب عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں تو یہ سیدھا اور صحیح علاج انسان کی سمجھ میں نہیں آتا اور وہ سیلاب وطوفان سے متاثر ہونے والے افراد کی مالی مدد کرنے کے لیے مثلاً ورائٹی شو اور ایکٹریسوں کا میچ کراتا ہے اور ٹکٹ فروخت کرکے یا کسی دوسرے طریقہ سے جو شرعاً ناجائز اور اللہ کو ناپسند ہو رقم حاصل کرتا ہے اور اس طرح اپنی ہمدردی کا ثبوت دیتا ہے، اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ انسان یہ جانتے اور مانتے ہوئے کہ گناہوں کی وجہ سے اللہ کا قہر وغضب نازل ہوتا ہے گناہوں کو ترک کرکے اللہ کو راضی کرنے کی بجائے پھر گناہ کرکے اس کے مزید قہر کو دعوت دے، اللہ کے قہر کو تو اللہ کا لطف ہی دور کرسکتا ہے اور وہ حاصل ہوتا ہے اوامر کے امتثال اور نواہی کے اجتناب سے۔

بہر حال سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن جیسا کہ کتاب وسنت سے ثابت ہے حقیقت ہے یہی کہ مصائب وحوادث (قحط، گرانی، پریشانی، بلاء، وباء، تباہی وبربادی، ہلاکت جان ومال، امساک باراں، پیداوار میں کمی وغیرہ) کا سبب حق سبحانہ وتعالیٰ کی نافرمانی وعدول حکمی اور معاصی (کثرت فواحش زنا ومقدمات زنا، لواطت ومقدمات لواطت، سود، شراب، ناپ تول میں کمی اور زکوٰۃ نہ ادا کرنا وغیرہ) کا ارتکاب ہے، جس خطۂ زمین پر زناکاری، شراب نوشی، سودخوری، رشوت ستانی، بے حیائی وعریانی، قتل وغارت گری، اغواء اغلام اور دوسرے فواحش ومعاصی کی کثرت ہو وہاں اللہ کی رحمت نازل ہوگی یا اس کا قہر وغضب؟ ؎

اس زمین پر آگ اور انگر برسنے چاہئیں   برق گرنی چاہیے اژدر برسنے چاہئیں

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جو شخص تندرست ہے، صاحب اولاد ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، جس کے پاس کثیر دولت، شاندار مکانات، عمدہ اور نفیس ساز وسامان، بیش قیمت اور آرام دہ سواریاں اور ملازم وخدمت گار موجود ہیں اور جس کو جاہ واقتدار، حکومت وعظمت اور سیادت وقیادت حاصل ہے وہ بہت خوش قسمت ہے اور اس کو سکون قلب حاصل ہے، یہ درست ہے کہ یہ تمام چیزیں اسباب راحت ہیں لیکن عین راحت نہیں، اسباب راحت اور راحت لازم وملزوم نہیں، یعنی یہ ضروری نہیں کہ جہاں اسباب راحت موجود ہوں وہاں راحت بھی ہو، دنیا اپنے غلط معیار کی بنا پر جن لوگوں کی ظاہری کامیابی اور کامرانی پر رشک کرتی ہے ان کے حالات کا قریب سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا جائے تو انسان بعض اوقات یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہ ناز ونعمت، عیش وعشرت اور آرام وراحت میں زندگی بسر کرنے والے، طوفان رنگ وبو میں غرق ہو جانے والے اور اپنے زعم باطل میں نغمہ ورقص، جام وسبو سے زندگی کی تلخیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنے والے اپنے پہلو میں کس قدر بے چین اور بے قرار دل رکھتے ہیں اور زندگی کی حقیقی لذتوں اور مسرتوں سے کس درجہ محروم اور ناآشنا ہیں، اسباب راحت کو لے کر کوئی کیا کرے؟ اس سے ثابت ہوا کہ اسباب راحت مقصود بالذات نہیں مقصود بالغیر ہیں۔

پھر وہ کونسا طریقہ ہے جس سے سکون قلب یقینی طور پر حاصل ہو جائے؟ اس کا جواب نہ سائنس دانوں کے پاس ہے اور نہ ارباب علم وحکمت کے پاس، اس کا جواب بھی قرآن ہی میں ہے، چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب (خوب سن لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے) ہم تلاش کرتے ہیں سکون قلب کو اعلیٰ درجہ کے ماکولات ومشروبات، ملبوسات ومسکونات، دولت وثروت میں، حکومت وسلطنت اور قیادت وامارت میں، حالانکہ یہ دولت صرف اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔

اگر آپ اپنی جدوجہد اور سعی وکاوش سے اسباب راحت جمع کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تب بھی بغیر ترک معاصی اور رجوع الی اللہ، تعلق مع اللہ اور ذکر اللہ کے نہ تو آپ کو غم واندوہ سے نجات ملے گی اور نہ سکون خاطر نصیب ہوگا۔ ع اے کاش ترے دل میں اتر جائے میری بات

مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم

درس قرآن کریم

مراتب ہدایت

مرتبہ اولیٰ

ہدایت بیان یعنی حق کو بیان کرنا اور واضح کرنا اور لوگوں کو حق کی تعلیم اور دعوت دینا اس معنٰی سے ہدایت اللہ کی طرف اور اس کے انبیاء و مرسلین اور ائمہ مجتہدین کی طرف منسوب ہوسکتی ہے۔ اللہ نے بھی حق کو بیان کیا اور اس کی طرف اپنے بندوں کو دعوت دی اور اس کے حکم سے انبیاء و مرسلین اور علماء نے بھی حق کو بیان کیا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دی اور اس کی طرف بلایا۔

قال اللہ تعالٰی انا ھدیناہ السبیل اماشاکرا واماکفورا۔وقال تعالٰی واماثمود فھدیناھم فستحبوا العمٰی علی الھدیٰ۔

تحقیق ہم نے انسان کو راستہ بتایا تو شکر کرے یا ناشکری کرے۔قوم ثمود کو ہم نے سیدھا راستہ بتایا لیکن انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔

اور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کو خطاب فرماتے ہیں وقال تعالٰی وجعلنامنھم ائمۃ یھدون بامرنا ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی راہنمائی کرتے تھے ان تمام آیتوں میں ہدایت بمعنی البیان مراد ہے اور یہ ہدایت اللہ رب العزت کے ساتھ مخصوص نہیں انبیاء اور علما کی طرف بھی اس کی اسناد ہوسکتی ہے، نیز یہ ہدایت اہل ایمان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مومن اور کافر سب کے لیے ہے۔

مرتبۂ ثانیہ

ہدایت توفیق یعنی خدا کا اپنے فضل و کرم سے بندہ کے لیے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کو اس کی خواہش اور طبعی میلان کے ایسا موافق بنا دینا کہ اس کی اطاعت لذیذ اور شیریں معلوم ہو اور اس کی معصیت حنظل سے بھی زیادہ تلخ معلوم ہو خیر کے اسباب اور دواعی کو اس کے لیے جمع کر دینا

اوراس کے تمام عوائق اور موانع کو یک لخت اٹھا دینا یہ ہدایت اللہ جل جلالہ کے ساتھ مخصوص ہے اس ہدایت پر نہ کوئی ملک مقرب قادر ہے اور نہ کوئی نبی مرسل کما قال تعالٰی انک لاتھدی من احببت ولکن اللّٰہ یھدی من یشاء تحقیق آپ جس کو چاہیں راہ پر نہیں چلا سکتے لیکن اللہ ہی جس کو چاہے راہ پر لائے ،اس آیت میں اللہ کے لیے جس ہدایت کو ثابت کیا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جس ہدایت کی نفی کی گئی وہ یہی ہدایت بمعنی التوفیق ہے اور انک لتھدی الی صراط مستقیم میں جس ہدایت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ ہدایت بمعنی البیان ودعوت الحق ہے، نبی کا کام ہی یہ ہے کہ حق کو بیان کرے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دے اور اس کی طرف بلائے مگر خداوندی اطاعت کا ہوائے نفسانی کے مطابق بنادینا اور خدا کی عبودیت اور بندگی کی حلاوت اور شیرینی کسی کے دل میں اتار دینا یہ سوائے اسی ملیک مقتدر کے کسی کے قبضہ میں نہیں چنانچہ حدیث میں ہے لایتوفق عبد حتی یوفقہ اللّٰہ بندہ خود بخود توفیق نہیں پاتا یہاں تک کہ خدا اس کو توفیق دے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام غزوہ احزاب میں خندقیں کھودتے وقت یہ پڑھتے تھے اللھم لولاانت مااھتدیناولاتصدقناولاصلینافانزل سکینۃ علینا اے اللہ تیری توفیق نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے اور نہ صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے پس تو ہم پر سکینت اور طمانیت نازل فرما۔

اور یہ ہدایت اہل ایمان کے ساتھ مخصوص ہے حق تعالیٰ اس نعمت کبریٰ اور رحمت عظمیٰ سے ان بندوں کو سرفراز فرماتا ہے کہ جو اس کی رضا اور خوشنودی کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت کی جانب گوشۂ چشم سے ایک ادنیٰ التفات کو بھی روا نہ رکھتے ہوں کما قال تعالیٰ یھدی بہ اللّٰہ من اتبع رضوانہ سبل السلام ویخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ ویھدیھم الی صراط مستقیم۔

جو اللہ کی رضامندی کا تابع ہو اس کو اللہ تعالیٰ سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لاتے ہیں اور سیدھے راستہ پر اس کو چلاتے ہیں۔

مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

درس حدیث

تشریح: اس حدیث میں بھی لاالٰہ الا اللہ کہنے والے پر آتش دوزخ حرام ہونے کا مطلب وہی ہے جو اسی مضمون کی سابقہ احادیث کی تشریح کے ضمن میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے بلکہ اس حدیث کی صحیح مسلم کی روایت میں بجائے قال لاالٰہ الا اللہ کے یشھد ان لاالٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ ہے اور مراد ان دونوں ہی عنوانوں سے دعوت اسلام قبول کرنا اور دین اسلام کو بحیثیت دین کے اختیار کرلینا ہے دراصل جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے عہد نبوی میں اسلام قبول کرنے اور اسلام کو اختیار کرنے کی یہ عام تعبیر تھی۔

یہاں ایک بات یہ بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ جن صحابی نے مالک بن دخشن کو منافق کہا تھا ان کی نظر میں بھی مالک بن دخشن میں نفاق یا فسق وفجور کی کوئی بات اس کے سوا نہ تھی کہ ان کے خیال میں مالک بن دخشن منافقین سے تعلقات و میل وملاقات رکھتے تھے۔

اس سے ایک طرف تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمانی جذبے کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اتنی سی بات سے بھی اس قدر ناراض ہوتے تھے اور اس کو منافقت سمجھتے تھے اور دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ جن لوگوں میں اس طرح کی کچھ کمزوریاں ہوں مگر اپنے ایمان اور توحید ورسالت کی شہادت میں وہ مخلص ہوں تو ان کے بارے میں ایسی بدگمانیاں اور اتنی سخت باتیں کرنی جائز نہیں بلکہ ایمان کا پہلو زیادہ قابل لحاظ اور واجب الاحترام ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مالک بن دخیشن بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابہ میں سے ہیں جو عام غزوات میں حتیٰ کہ بدر میں بھی شریک رہے ہیں ممکن ہے کہ منافقین سے تعلقات رکھنے میں حاطب بن ابی بلتعہ کی طرح ان کی بھی کچھ مجبوریاں ہوں، واللہ اعلم۔

عن ابی ھریرۃ قال کنا قعوداً حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ومعناابوبکروعمرفی نفرفقام رسول اللّٰہصلی اللّٰہعلیہ وسلم من بین اظھرنافأبطأعلیناوخشیناان یقتطع دونناوفزعنافقمنافکنت اول من فزع فخرجت ابتغی رسول اللّٰہصلی اللّٰہعلیہ وسلم حتی اتیت حائطاً للانصارلبنی النجارفدرت بہ ھل اجدلہ باباًفلم اجد فاذاربیع یدخل فی جوف حائط من بیرخارجة(والربیع الجدول)قال فاحتفزت فدخلت علی رسول اللّٰہصلی اللّٰہعلیہ وسلم فقال ابوھریرة،فقلت نعم یارسول اللّٰہ!قال ماشانک ؟قلت کنت بین اظھرنافقمت فابطأت علینا فخشینا ان تقتطع دوننافغزعنافکنت اول من فزع فاتیت ھذاالحائط فاحتفزت کما یحتفزالثعلب وھولاء الناس ورائی فقال یااباھریرةواعطانی نعلیہ فقال اذھب بنعلی ھاتین فمن لقیک من وراء ھذاالحائط یشھدان لاالہ الااللّٰہ مستیقناًبھاقلبہ فبشرہ بالجنةفکان اول من لقیت عمرفقال ماھاتان النعلان یااباھریرة؟فقلت ھاتان نعلارسول اللّٰہصلی اللّٰہعلیہ وسلم بعثنی بھمامن لقیت یشھدان لاالہ الااللّٰہمستیقناًبھاقلبہ بشرتہ بالجنة،فضرب عمربین ثدیفخررت لاستی فقال ارجع یااباھریرة!فرجعت الی رسول اللّٰہصلی اللّٰہعلیہ وسلم فاجھشت بالبکاء ورکبنی عمرواذاھوعلی اثری فقال رسول اللّٰہصلی اللّٰہعلیہ وسلم مالک یااباھریرةقلت لقیت عمر فاخبرتہ بالذی بعثتنی بہ فضرب بین ثدي ضربةخررت لاستی فقال ارجع فقال رسول اللّٰہصلی اللّٰہعلیہ وسلم یاعمرماحملک علی مافعلت ؟فقال یارسول اللّٰہبابی انت وامی ابعثت اباھریرةبنعلیک من لقی یشھدان لاالہ الااللّٰہمستیقناًبھاقلبہ بشرہ بالجنة؟ قال نعم !قال فلاتفعل فانی اخشی ان یتکل الناس علیھافخلھم یعملون،فقال رسول اللّٰہصلی اللّٰہ علیہ وسلم فخلھم (رواہ مسلم)

مرسلہ: محمد صدیق عفا اللہ عنہ

ملفوظات حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ

بقلم: حضرت مولانا حافظ ابرارالحق صاحب حقی تصحیح: مولانا محمد اسعد اللہ رامپوری قدس سرہما

O فرمایا مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری مشہور ادیب کا مشرب ہمارے اکابر کے مسلک معتدل سے کسی قدر جدا تھا لیکن باوجود اس کے ان کو ہمارے اکابر سے محبت بہت تھی۔ دیکھئے پہلے بزرگوں میں اختلاف مشرب ومسلک کے ساتھ بھی باہمی تعلقات خوشگوار ہوتے تھے ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرتے تھے اور ایک آج کل کے لوگ ہیں کہ اتحاد مشرب ومسلک کے باوجود بھی آپس میں محبت نہیں تعلقات میں شگفتگی نہیں۔

(دیکھنا رشک اس کی محفل کا ایک کو ایک کھائے جاتا ہے ۱۲ جامع)

مولانا فیض الحسن صاحب ہمارے اکابر کے باہم اختلاف واتفاق پر مزاحاً فرمایا کرتے تھے ان وہابیوں میں اتفاق واتحاد بہت ہے اور یہ سب برکت ان بڑے میاں کی ہے یعنی حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز کی۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ مولانا فیض الحسن سماع پر بھی نکیر نہ کرتے تھے اس کے علاوہ بعض دوسرے مسائل میں بھی ہمارے اکابر کا اور ان کا اختلاف تھا مگر ہمارے بزرگوں کی رائے ان کے متعلق اچھی تھی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے ان کے متعلق دریافت کیا گیا، مولانا نے فرمایا بھائی مولوی فیض الحسن کا ظاہر برا ہے اور باطن اچھا ہے اور ہمارا باطن برا ہے اور ظاہر اچھا ہے۔

O اسی سلسلہ میں فرمایا میں نے مولانا فیض الحسن صاحب کے داماد سے سنا ہے کہ ان کی وفات کے بعد مسلسل ایک ماہ تک اس جگہ سے جہاں وفات ہوئی تھی بہت عمدہ خوشبو آتی رہی۔ حضرت مولانا قاسم صاحب سے کسی نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا مجھے معلوم ہے کہ لڑکپن سے ہر شب جمعہ میں فجر تک درود شریف پڑھا کرتے تھے ایک لمحہ کو نہ سوتے تھے اور آخر عمر تک اس معمول کو نباہا۔

مولانا فیض الحسن صاحب سب سے بے تکلف تھے ۔حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے والد شیخ اسد علی صاحب کھیتی کیا کرتے تھے آپ نے ایک مرتبہ کہا ارے اسد علی کے بیٹے تجھے مولوی کس نے کردیا تیرے پاس تو دو بیل ہوتے اوران کے کندھوں پر تیرے ہاتھ ہوتے اور جنگل میں تک تک بر بر کرتا پھرتا ،حضرت مولانا نے فوراً ہی ایک ہاتھ مولانا فیض الحسن صاحب کے کندھے پر رکھ کر فرمایا کہ ایک تو مل گیا ہے دوسرے کی تلاش میں ہوں وہ بھی مل جائے تو یہی کام کیا کروں گا ۔گومولانا فیض الحسن صاحب بہت ذہین تھے مگر اس وقت کوئی جواب نہ بن پڑا اورخاموش ہوگئے یہ حضرت مولانا ہی کا کام تھا کہ ان کو خاموش کردیا ورنہ وہ کسی سے چپ ہونے والے نہ تھے ۔ان بزرگوں کا اختلاف بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے سے تھا باقی ہنسنا ،بولنا ،مزاح باہم خوب رہتا تھا ،مولانا فیض الحسن صاحب بے باک تو تھے ہی حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا کہ حضرت آپ سے بیعت ہونے کو جی چاہتا ہے مگر دو شرطیں ہیں اول یہ کہ کبھی خط وکتابت نہ کروں گا ،دوسری شرط یہ ہے کہ نذرانہ کبھی نہ دوں گا ۔دیکھئے پیر سے بھی ایسی گفتگو کی حضرت حاجی صاحب نے فرمایا جتنی شرطیں کرو سب منظور ہیں ۔

مولانا فیض الحسن صاحب حضرت کے عاشق تھے اورعشاق کے لیے ظاہر ادب کی ضرورت نہیں رہتی ہے عارف رومی اسی کے متعلق فرماتے ہیں ۔

گفتگوئے عاشقاں درکار رب جوشش عشق است نے ترک ادب

بے ادب تر نیست زوکس در جہان با ادب تر نیست زوکس درنہان

شعراء محبوب کو ظالم ،ستمگر ،جفا کار ،قاتل سفاک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں ،کیا یہ بے ادبی ہے عاشق صادق ظاہراً کچھ معاملہ کرے مگر بوقت ضرورت جان دینے والا اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا ،مثنوی شریف میں ایک حکایت ہے کہ کوئی عاشق محبوب سے اپنا حال زبوں بیان کررہا تھا کہ میں نے تمہارے عشق میں یہ یہ کیا اس پر محبوب نے کہا کہ سب کچھ کیا مگر اصلی حق محبت کا ادا نہ کیا یعنی جان نہ دی یہ سن کر یہ عاشق گرا اور گرتے ہی ختم ہوگیا ۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے

(آخری قسط)

سجدے میں جاتے وقت

سجدے میں جاتے وقت اس طریقے کا خیال رکھیں کہ:

(۱) سب سے پہلے گھٹنوں کو خم دے کر انہیں زمین کی طرف اس طرح لے جائیں کہ سینہ آگے کو نہ جھکے، جب گھٹنے زمین پر ٹک جائیں، اس کے بعد سینے کو جھکائیں۔

(۲) جب تک گھٹنے زمین پر نہ ٹکیں، اس وقت تک اوپر کے دھڑ کو جھکانے سے حتی الامکان پرہیز کریں۔

آج کل سجدے میں جانے کے اس مخصوص ادب سے بے پروائی بہت عام ہوگئی ہے، اکثر لوگ شروع ہی سے سینہ آگے کو جھکا کر سجدے میں جاتے ہیں، لیکن صحیح طریقہ وہی ہے جو نمبر (۱) اور نمبر (۲) میں بیان کیا گیا ہے، بغیر کسی عذر کے اس کو نہ چھوڑنا چاہیے۔

(۳) گھٹنوں کے بعد پہلے ہاتھ زمین پر رکھیں، پھر ناک، پھر پیشانی۔

سجدے میں

(۱) سجدے میں سر کو دونوں ہاتھوں کے درمیان اس طرح رکھیں کہ دونوں انگوٹھوں کے سرے کانوں کی لو کے سامنے ہوجائیں۔

(۲) سجدے میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بند ہونی چاہئیں، یعنی انگلیاں بالکل ملی ملی ہوں، اور ان کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔

(۳) انگلیوں کا رخ قبلے کی طرف ہونا چاہیے۔

(۴) کہنیاں زمین سے اٹھی ہونی چاہئیں، کہنیوں کو زمین پر ٹیکنا درست نہیں۔

(۵) دونوں بازو پہلوؤں سے الگ ہٹے ہوئے ہونے چاہئیں انہیں پہلوؤں سے بالکل ملا کر نہ رکھیں۔

(۶) کہنیوں کو دائیں بائیں اتنی دور تک بھی نہ پھیلائیں جس سے برابر کے نماز پڑھنے والوں کو تکلیف ہو۔

(۷) رانیں پیٹ سے ملی ہوئی نہیں ہونی چاہئیں پیٹ اور رانیں الگ الگ رکھی جائیں۔

(۸) دونوں پاؤں اس طرح کھڑے رکھے جائیں کہ ایڑیاں اوپر ہوں، اور تمام انگلیاں اچھی طرح مڑ کر قبلہ رخ ہوگئی ہوں، جو لوگ اپنے پاؤں کی بناوٹ کی وجہ سے تمام انگلیاں موڑنے پر قادر نہ ہوں وہ جتنی موڑ سکیں اتنی موڑنے کا اہتمام کریں بلاوجہ انگلیوں کو سیدھا زمین پر ٹیکنا درست نہیں۔

(۹) اس بات کا خیال رکھیں کہ سجدے کے دوران پاؤں زمین سے اٹھنے نہ پائیں، بعض لوگ اس طرح سجدہ کرتے ہیں کہ پاؤں کی کوئی انگلی ایک لمحہ کے لیے بھی زمین پر نہیں ٹکتی، اس طرح سجدہ ادا نہیں ہوتا اور نتیجۃً نماز بھی نہیں ہوتی، اس سے اہتمام کے ساتھ پرہیز کریں۔

(۱۰) سجدے کی حالت میں کم از کم اتنی دیر گزاریں کہ تین مرتبہ سبحان ربی الاعلی اطمینان کے ساتھ کہہ سکیں، پیشانی ٹیکتے ہی فوراً اٹھا لینا منع ہے۔

دونوں سجدوں کے درمیان

(۱) ایک سجدے سے اٹھ کر اطمینان سے دوزانوں سیدھے بیٹھ جائیں، پھر دوسرا سجدہ کریں، ذرا سا سر اٹھا کر سیدھے ہوئے بغیر دوسرا سجدہ کر لینا گناہ ہے اور اس طرح کرنے سے نماز کا لوٹانا واجب ہو جاتا ہے۔

(۲) بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھیں اور دایاں پاؤں اس طرح کھڑا کر لیں کہ اس کی انگلیاں مڑ کر قبلہ رخ ہو جائیں، بعض لوگ دونوں پاؤں کھڑے کر کے ان کی ایڑیوں پر بیٹھ جاتے ہیں، یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔

(۳) بیٹھنے کے وقت دونوں ہاتھ رانوں پر رکھے ہونے چاہئیں، مگر انگلیاں گھٹنوں کی طرف لگی ہوئی نہ ہوں، بلکہ انگلیوں کے آخری سرے گھٹنے کے ابتدائی کنارے تک پہنچ جائیں۔

(۴) بیٹھنے کے وقت نظریں اپنی گود کی طرف ہونی چاہئیں۔

(۵) اتنی دیر بیٹھیں کہ اس میں کم از کم ایک مرتبہ سبحان اللہ کہا جا سکے اور اگر اتنی دیر بیٹھیں کہ اس میں اللھم اغفرلی وارحمنی واسترنی واجبرنی واھدنی وارزقنی پڑھا جا سکے تو بہتر ہے، لیکن فرض نمازوں میں یہ پڑھنے کی ضرورت نہیں نفلوں میں پڑھ لینا بہتر ہے۔

دوسرا سجدہ اور اس سے اٹھنا

(۱) دوسرے سجدے میں بھی اس طرح جائیں کہ پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھیں، پھر ناک، پیشانی۔

(۲) سجدے کی ہیئت وہی ہونی چاہیے جو پہلے سجدے میں بیان کی گئی۔

(۳) سجدے سے اٹھتے وقت پہلے پیشانی زمین سے اٹھائیں پھر ناک، پھر ہاتھ، پھر گھٹنے۔

(۴) اٹھتے وقت زمین کا سہارا نہ لینا بہتر ہے، لیکن اگر جسم بھاری ہو اور بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے مشکل ہو تو سہارا لینا بھی جائز ہے۔

(۵) اٹھنے کے بعد ہر رکعت کے شروع میں سورۃ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھیں۔

قعدے میں

(۱) قعدے میں بیٹھنے کا وہی طریقہ ہوگا جو سجدوں کے بیچ میں بیٹھنے کا ذکر کیا گیا۔

(۲) التحیات پڑھتے وقت جب "اشھد ان لا" پر پہنچیں تو شہادت کی انگلی اٹھا کر اشارہ کریں اور "الا اللہ" پر گرا دیں۔

(۳) اشارے کا طریقہ یہ ہے کہ بیچ کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر حلقہ بنائیں، چھنگلی

اوراس کے برابر والی انگلی کو بند کرلیں اور شہادت کی انگلی کو اس طرح اٹھائیں کہ انگلی قبلے کی طرف جھکی ہوئی ہو، بالکل سیدھی آسمان کی طرف نہ اٹھانی چاہیے۔

(۴) "الا اللّٰہ" کہتے وقت شہادت کی انگلی تو نیچے کرلیں لیکن باقی انگلیوں کی جو ہیئت اشارے کے وقت بنائی تھی اس کو آخر تک برقرار رکھیں۔

سلام پھیرتے وقت

(۱) دونوں طرف سلام پھیرتے وقت گردن کو اتنا موڑیں کہ پیچھے بیٹھے آدمی کو آپ کے رخسار نظر آجائیں۔

(۲) سلام پھیرتے وقت نظریں کندھے کی طرف ہونی چاہئیں۔

(۳) جب دائیں طرف گردن پھیر کر السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ کہیں تو یہ نیت کریں کہ دائیں طرف جو انسان اور فرشتے ہیں ان کو سلام کر رہے ہیں اور بائیں طرف سلام پھیرتے وقت بائیں طرف موجود انسانوں اور فرشتوں کو سلام کرنے کی نیت کریں۔

دعا کا طریقہ

(۱) دعا کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ اتنے اٹھائے جائیں کہ وہ سینے کے سامنے آجائیں، دونوں ہاتھوں کے درمیان معمولی سا فاصلہ ہو، نہ ہاتھوں کو بالکل ملائیں اور نہ دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ رکھیں۔

(۲) دعا کرتے وقت ہاتھوں کے اندرونی حصے کو چہرے کے سامنے رکھیں۔

خواتین کی نماز

پیچھے نماز کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے وہ مردوں کے لیے ہے، عورتوں کی نماز مندرجہ ذیل معاملات میں مردوں سے مختلف ہے، لہٰذا خواتین کو ان مسائل کا خیال رکھنا چاہیے:

(۱) خواتین کو نماز شروع کرنے سے پہلے اس بات کا اطمینان کرلینا چاہیے کہ ان کے چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کے سوا تمام جسم کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے۔ بعض خواتین کی کلائیاں کھلی رہتی ہیں۔ بعض خواتین کے کان کھلے رہتے ہیں۔ بعض خواتین اتنا چھوٹا دوپٹہ استعمال کرتی ہیں

کہ اس کے نیچے بال لٹکے نظر آتے ہیں ۔یہ سب طریقے ناجائز ہیں ،اوراگر نماز کے دوران چہرے،ہاتھ اور پاؤں کے سوا جسم کا کوئی عضو بھی چوتھائی کے برابر اتنی دیر کھلا رہ گیا جس میں تین مرتبہ سبحان ربی العظیم کہا جا سکے تو نماز ہی نہیں ہوتی،اور اس سے کم کھلا رہ گیا تو نماز ہو جائے گی مگر گناہ ہوگا۔

(۲)خواتین کے لیے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے سے افضل ہے اور برآمدے میں پڑھنا صحن سے افضل ہے۔

(۳)عورتوں کو نماز شروع کرتے وقت ہاتھ کانوں تک نہیں بلکہ کندھوں تک اٹھانے چاہئیں ،اور وہ بھی دوپٹے کے اندر ہی اٹھانے چاہئیں ، دوپٹے سے باہر نہ نکالے جائیں ۔ (بہشتی زیور)

(۴)عورتیں ہاتھ سینے پر اس طرح باندھیں کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ دیں،انہیں مردوں کی طرح ناف پر ہاتھ نہیں باندھنے چاہئیں ۔

(۵)رکوع میں عورتوں کے لیے مردوں کی طرح کمر کو بالکل سیدھا کرنا ضروری نہیں، عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کم جھکنا چاہیے(طحطاوی علی المراقی ص ۱۴۱)

(۶)رکوع کی حالت میں مردوں کو انگلیاں گھٹنوں پر کھول کر رکھنی چاہئیں لیکن عورتوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ انگلیاں ملا کر رکھیں،یعنی انگلیوں کے درمیان فاصلہ نہ ہو(درمختار)

(۷)عورتوں کو رکوع میں اپنے پاؤں بالکل سیدھے نہ رکھنے چاہئیں بلکہ گھٹنوں کو آگے کی طرف ذرا سا خم دے کر کھڑا ہونا چاہیے۔

(۸)مردوں کو حکم یہ ہے کہ رکوع میں ان کے بازو پہلوؤں سے جدا اور تنے ہوئے ہوں لیکن عورتوں کو اس طرح کھڑا ہونا چاہیے کہ ان کے بازو پہلوؤں سے ملے ہوئے ہوں۔ (درمختار)

(۹)عورتوں کو دونوں پاؤں ملا کر کھڑا ہونا چاہیے ،خاص طور پر دونوں ٹخنے تقریباً مل جانے چاہئیں،پاؤں کے درمیان فاصلہ نہ ہونا چاہیے(بہشتی زیور)

(۱۰) سجدے میں جاتے وقت مردوں کے لیے یہ طریقہ بیان کیا گیا ہے کہ جب تک گھٹنے زمین پر نہ ٹکیں، اس وقت تک وہ سینہ نہ جھکائیں، لیکن عورتوں کے لیے یہ طریقہ نہیں ہے، وہ شروع ہی سے سینہ جھکا کر سجدے میں جا سکتی ہیں۔

(۱۱) عورتوں کو سجدہ اس طرح کرنا چاہیے کہ ان کا پیٹ رانوں سے بالکل مل جائے اور بازو بھی پہلوؤں سے ملے ہوئے ہوں، نیز عورت پاؤں کو کھڑا کرنے کی بجائے انہیں دائیں طرف نکال کر بچھا دے۔

(۱۲) مردوں کے لیے سجدے میں کہنیاں زمین پر رکھنا منع ہے، لیکن عورتوں کو کہنیوں سمیت پوری بانہیں زمین پر رکھ دینی چاہئیں (درمختار)

(۱۳) سجدوں کے درمیان اور التحیات کے لیے جب بیٹھنا ہو تو بائیں کولھے پر بیٹھیں اور دونوں پاؤں دائیں طرف کو نکال دیں اور دائیں پنڈلی پر رکھیں (طحطاوی)

(۱۴) مردوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ رکوع میں انگلیاں کھول کر رکھنے کا اہتمام کریں اور سجدے میں بند رکھنے کا، اور نماز کے باقی افعال میں انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیں، نہ بند کرنے کا اہتمام کریں نہ کھولنے کا، لیکن عورتوں کے لیے ہر حالت میں حکم یہ ہے کہ وہ انگلیوں کو بند رکھیں، یعنی ان کے درمیان فاصلہ نہ چھوڑیں اور رکوع میں بھی، سجدے میں بھی، دو سجدوں کے درمیان بھی اور قعدہ میں بھی۔

(۱۵) عورتوں کا جماعت کرنا مکروہ ہے، ان کے لیے اکیلی نماز پڑھنا بہتر ہے، البتہ اگر گھر کے محرم افراد گھر میں جماعت کر رہے ہوں تو ان کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن ایسے مردوں کے بالکل پیچھے کھڑا ہونا ضروری ہے، برابر میں ہرگز کھڑی نہ ہوں۔

فقیہ العصر مفتی سید عبدالشکور ترمذی قدس سرہ

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے نظریات پر

ایک تحقیقی نظر (آخری قسط)

دسواں نمونہ

بیک وقت طلاق ثلاثہ کے دینے کا رواج عوام میں قابل اصلاح اور لائق منع ہے مگر ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص نے بیک وقت تین طلاقیں دیدیں تو واقع ہو جائیں گی اب مودودی صاحب کی سنیے لکھتے ہیں" رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی جائیں جیسا کہ آج کل جہلاء کا عام طریقہ ہے تو یہ شریعت کی رو سے سخت گناہ ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے" (تفہیم القرآن جلد اول ص ۱۷۴)

یہ تو درست ہے کہ شریعت کی رو سے تین طلاقوں کا بیک وقت دے ڈالنا سخت گناہ ہے لیکن اگر کوئی شخص باوجود گناہ ہونے کے ایسا کر ڈالے تو اس کے بارہ میں مودودی صاحب کا کیا حکم ہے، آیا وہ تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی یا وہ واقع بھی نہ ہوں گی۔ اس کے متعلق مودودی صاحب نے اس مقام پر کچھ نہیں لکھا بظاہر تو وہ وقوع کا بھی انکار کر رہے ہیں۔

گیارھواں نمونہ

تفہیم القران جلد اول ص ۱۴۶ پر لکھتے ہیں:" سحری میں سیاہی شب سے سپیدہ سحر کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لئے بالکل صحیح ہے کہ اگر عین طلوع فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی ہو تو وہ جلدی سے اٹھ کر کچھ کھا پی لے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آ جائے تو فوراً چھوڑ نہ دے بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے"۔

حدیث سے غالباً مودودی صاحب کی مراد وہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہے جس کو

ابوداود نے الفاظ ذیل سے روایت کیا ہے:

اذا سمع النداء احدکم والاناء في يده فلايضعه حتى يقضي حاجته منه (مشکوۃ ص ۱۷۵) مگر اس حدیث میں اذان سے صبح کی اذان مراد ہوتو اذان بلال مراد ہوگی، کیونکہ وہ صبح صادق سے پہلے شب میں تہجد کے لئے اذان کہا کرتے تھے جو بعد میں منسوخ ہوگئی، اس کے متعلق کے حکم دیا جارہا ہے کہ اذان بلال سن کر کھانا پینا نہ چھوڑا جائے کیونکہ ابھی سحری کا وقت باقی ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ رات کے حصہ میں اذان دیتے ہیں جیسا کہ دوسری حدیث میں صاف طور پر اس کی تصریح آ گئی ہے ان بلالا كان يؤذن بليل فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم كلوا واشربوا حتى يؤذن ابن ام مكتوم فانه لايؤذن حتى يطلع الفجر الخ (بخاری شریف ص ۲۵۷ جلد ۱)

غرضیکہ اس حدیث میں اس پر کچھ دلالت نہیں ہے کہ عین طلوع کے وقت آنکھ کھلنے پر صبح صادق کا یقین ہوتے ہوئے بھی سحری کھا پی لی جایا کرے جیسا کہ مودودی صاحب نے سمجھا ہے۔

بارہواں نمونہ

قرآن شریف اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ام البشر حضرت حواء جناب حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کی گئی تھیں حق تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتے ہیں: يا ايها الناس اتقوا ربكم الذي خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها۔

شاہ ولی اللہ صاحب اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں ''اے مردماں! بترسید ازان پروردگار خویش کہ بیافرید شمارا از یک کس وآفرید ازاں یک کس زن اورا۔

حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ''لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے بنایا تم کو ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا''۔

تفسیر جلالین میں اس آیت کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے ''اے لوگو! اپنے رب (یعنی اس کے عقاب) سے ڈرو (اس طرح کہ اس کی اطاعت کرو) جس نے تم کو ایک کس (آدم) سے پیدا کیا اور اس ایک کس سے اس کی بیوی (حوا) کو (اس کی بائیں پسلی سے) پیدا کیا۔

مشکوٰۃ کے باب عشرۃ النساء میں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ارشادگرامی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کے حق میں میری طرف سے حسن سلوک کرنے کی وصیت قبول کرو اس لئے کہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں، اور بلاشبہ پسلیوں میں سب سے ٹیڑھی اوپر کی پسلی ہے اگر تم اس کے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو اس کو توڑ دوگے اور اگر اس کے حال پر چھوڑ دوگے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی پس تم لوگ عورتوں کے حق میں میری وصیت قبول کرو، رواہ البخاری و مسلم (مشکوٰۃ ص ۲۸)

لیکن ان تمام تصریحات کو پس پشت ڈال کر جمہور کے خلاف ابو مسلم اصفہانی معتزلی کی طرح (جس سے حضرت حواء کی پیدائش کے معروف اور مسلم واقعہ کے انکار کی ابتداء ہوتی ہے) مودودی صاحب حضرت حواء کے پسلی سے پیدا ہونے کے منکر ہیں ان کی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھا ہے "اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے علم میں نہیں ہے عام طور پر جو بات اہل تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو ماقبل میں بھی بیان کی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حواء کو پیدا کیا گیا ہے لیکن کتاب اللہ اس بارہ میں خاموش ہے اور جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے، لہٰذا بہتر ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے مجمل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے" (تفہیم القرآن جلد اول ص ۳۱۹، ۳۲۰)

بخاری اور مسلم کی اس متفق علیہ حدیث کا جو مفہوم جمہور علماء نے سمجھا ہے جو مودودی صاحب کے نزدیک اگر اس کا وہ مفہوم نہیں تھا تو یہ تو بتلایا ہوتا کہ آخر ان کے نزدیک اس کا مفہوم ہے کیا جس کو جمہور علماء آج تک نہیں سمجھ سکے۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ "خدا نے پیدائش حواء کا مسئلہ مجمل رکھا ہے اس لئے اس کو مجمل ہی رکھنا چاہیے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے" حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خلق منھا زوجھا فرما کر صراحۃ بتادیا کہ حضرت حواء جناب آدم نبی اللہ علیہ السلام ہی کے جسد مبارک سے متولد ہوئی تھیں اور علماء نے حدیث بخاری و مسلم سے اس کی یہی تفصیل سمجھی اور خود مودودی صاحب کے کلام میں ہے کہ "اسی

جان سے اس کا جوڑا بنایا'' مگر پھر بھی مودودی صاحب کے نزدیک ''یہ بیان مجمل ہے اور مجمل کو مجمل ہی رہنے دیا جائے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے'' جب حدیث بخاری اور مسلم سے اس کی تفصیلی کیفیت کا متعین ہونا علماء نے سمجھا ہے تو کیا حدیث سے تفصیلی کیفیت کے متعین ہوجانے کے بعد بھی اس کو مجمل ہی رکھا جائے گا اور اس کی تفصیل میں وقت ضائع نہیں کیا جائے گا تو پھر کیا اس اصول پر فریضہ نماز اور زکوۃ کو بھی مجمل ہی رہنے دیا جائے گا، اور ان کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا جائے گا؟ کیونکہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ یہ نہیں بتایا گیا کہ کس کس اوقات میں کتنی کتنی رکعتیں کس طرح پڑھی جائیں اور زکوۃ کے بارہ میں بھی نہیں فرمایا گیا کہ اس کا نصاب کتنا ہے اور کتنی مدت کے بعد کتنی زکوۃ دی جائے۔ مودودی صاحب کے اصول پر تو ان کی تفصیلی کیفیت کے متعین کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے، پھر اب فریضہ نماز وزکوۃ کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی۔

تیرہواں نمونہ

مودودی صاحب تفہیم القرآن میں بھی اور حقوق الزوجین ص ۳۸ بحث ایلاء میں بھی لکھتے ہیں کہ ''شوہر قسم کھائے یا نہ کھائے تکلیف دینے کی غرض سے اگر چار ماہ بیوی سے علیحدہ رہے تو اس کی بیوی کو طلاق ہوجائے گی'' حالانکہ یہ بات ساری امت میں آج تک کسی نے نہیں کہی نہ کسی آیت وحدیث سے مفہوم ہوتی ہے۔ بغیر قسم کے حلال بیوی کو حرام بنانا، خدا اور رسول پر تہمت اور ومن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا میں داخل ہونا ہے۔ قرآن شریف میں ہے ''للذین یؤلون من نسائھم تربص اربعة اشھر '' جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس جانے سے قسم کھا بیٹھیں ان کو چار ماہ کی مہلت ہے، حق تعالیٰ قسم کھانے والوں کا حکم بیان فرماتے ہیں کیونکہ ایلاء کہتے ہی قسم کھانے کو ہیں تو یہاں خدا تعالیٰ کے نام مبارک کی توہین ہورہی ہے کفارہ اس وجہ سے ہوتا ہے، مگر مودودی صاحب کہتے ہیں کہ قسم کھائے یا نہ کھائے سب کا حکم ایک ہی ہے یہ عجیب اجتہاد ہے کہ تکلیف دینے کی نیت سے چار ماہ علیحدہ رہنے سے تو بیوی کو تکلیف ہوتی ہے لیکن اگر کوئی شخص اضرار کی نیت کئے بغیر اپنی بیوی سے علیحدہ رہے تو مودودی

صاحب کے نزدیک اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ۔اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ تکلیف ہونے نہ ہونے کا مدار شوہر کی نیت اضرار پر ہے علیحدہ رہنے یا نہ رہنے پر نہیں ہے اگر چہ وہ برسوں علیحدہ رہے ۔اور دوسری بات یہ کہ اگر اضرار کی نیت نہ ہو اور قسم کھا کر چار ماہ یا زیادہ الگ رہے گا تو مودودی صاحب کے نزدیک کچھ نہ ہوگا حالانکہ یہ قرآن کے خلاف ہوگا ۔جو شخص چار ماہ یا مدت معین کئے بغیر بیوی سے علیحدہ رہنے کی قسم کھاتا ہے اب اگر وہ اس مدت کے اندر اپنی بیوی سے ہم بستر ہوتا ہے تو اس کو کفارہ کا بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے بخلاف اس شخص کے جو قسم کھائے بغیر اضرار کی نیت سے علیحدہ رہے کیونکہ وہ جب چاہے اس نیت کو بدل سکتا ہے چونکہ خدا تعالیٰ کے نام کی توہین اس میں نہیں ہے اس کی نیت کی تبدیلی کفارہ کا سبب نہیں اور اس نیت کے بدلنے کی وجہ سے اس پر کسی قسم کے کفارہ وغیرہ کا بوجھ نہیں پڑتا ،آخر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ بدون لفظ طلاق یا اس کے معنی کے نیت اضرار سے کیسے طلاق واقع ہو سکتی ہے جبکہ خود اضرار مار پیٹ سے بھی طلاق واقع نہیں ہو سکتی بلکہ نیت طلاق سے بھی بلا تلفظ طلاق واقع نہیں ہو سکتی ۔

قرآن وحدیث اور ساری امت کے خلاف یہ عجیب منطق ہے کہ قسم وبلا قسم کا ایک حکم ہے پھر دونوں کا حال یکساں کیسے ہو سکتا ہے اور ایک کا قیاس دوسرے پر کیا جا سکتا ہے ۔

چودھواں نمونہ

مودودی صاحب تفہیم القرآن میں الاقوم یونس لما آمنوا الخ کے تحت لکھتے ہیں کہ ''حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں......پس نبی جب اداء رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود اپنی جگہ سے ہٹ گیا'' الخ (تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳۱۲)

ایک پیغمبر کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انہوں نے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں کیں ،کس قدر جرأت اور بے جا جسارت ہے کسی پیغمبر سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں ہرگز ہرگز کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ ''کوتاہیاں'' ہوں ۔اس واقعہ میں بھی حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی کے اندر کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی اور نہ کسی حکم کی مخالفت

ہوئی ہے صرف اتنی بات ہوئی کہ وحی کا انتظار کئے بغیر بستی سے اپنے چلے جانے کو اجتہاداً جائز سمجھا اور جائز سمجھنے کا موقع بھی تھا کیونکہ عادۃ اللہ جاری ہے کہ عذاب سے نیکوکاروں کو محفوظ رکھتے ہیں جیسے حضرت لوط علیہ السلام کو جانے کا حکم تھا، حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم تھا، اس لیے موقع عذاب سے نکل جانا جائز تھا، اس بنا پر وہ یہ سمجھے کہ میں جائز کام کر رہا ہوں اس لئے اس میں مجھ پر کوئی داروگیر نہ ہوگی، لیکن جب تک وحی کی امید ہو اس وقت تک انبیاء علیہ السلام کو وحی کا انتظار مناسب ہے اس مناسب صورت کے چھوڑ دینے پر ان کے بلند و بالا مقام کے لحاظ سے ان کو یہ ابتلاء پیش آیا ورنہ ایسی اجتہادی غلطی امت کے لئے معاف ہے بلکہ اس پر ایک گونہ ثواب ملتا ہے مگر انبیاء علیہم السلام کی تربیت زیادہ مقصود ہوتی ہے اس لئے اس پر داروگیر ہوئی ہے۔ اور یہ تو مودودی صاحب نے بالکل ہی من گھڑت بات کہی ہے کہ "حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود اپنی جگہ سے ہٹ گئے" اس کا ان کے پاس کیا ثبوت ہے اور وہ کون سی آیت قرآنی اور حدیث نبوی ہے جس سے حضرت یونس علیہ السلام کے لیے وقت کا مقرر ہونا معلوم ہوتا ہے؟

پندرھواں نمونہ

مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ "نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہوگیا تھا کہ انہوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا تھا" (رسائل و مسائل ص ۳۱/۱۴۱ ج ۱)

کافروں کی حکومت میں ایک مظلوم سے ظلم کو رفع کرنے کی غرض سے بطور تنبیہ کسی کافر اور ظالم کو مکا ماردینا اول تو "بڑا گناہ" اور "بہت بڑا گناہ" ہونا تو درکنار سرے سے کوئی گناہ ہی نہیں۔ اور مودودی صاحب کا یہ لکھ کر کہ انہوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا تھا "حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ایک انسان کے قتل کو منسوب کرنا تو بالکل ہی غلط ہے کیونکہ انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ صرف مکا مارا تھا جس سے وہ مرگیا یہ فقط سزا دینا تھا۔ قرآن مجید میں فوکزہ کا لفظ ہے جو سزا کے لیے مکا مارنے کیلئے ہے نہ قتل کا قصد تھا نہ کوئی آلہ قتل کا تھا اس کو "قتل کر دیا تھا" کہہ کر ایک گناہ عظیم کی صورت میں ظاہر کرنا ایک نبی پر تہمت لگانے سے کم نہیں ہوتا اس کو

ہرگز مناسب نہیں کہا جاسکتا، جس کی تعبیر انہیں ''ایک انسان کو قتل کر دیا تھا'' کی بجائے ''ان سے ایک انسان بلا ارادہ خطأ مر گیا تھا'' سے کرنی چاہئے تھی۔

سولہواں نمونہ

مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ ''اوریا کے قصہ میں داؤد علیہ السلام کی خواہش نفس کو بھی دخل تھا حالانکہ خواہش نفس کی طرف اولیاء اللہ کے افعال کو منسوب کرنا بھی نازیبا اور گستاخی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی شان تو بہت ہی ارفع اور بلند ہوتی ہے ان کے مطہر اور مزکی نفوس کی طرف ایسے افعال کی نسبت کرنا قطعاً غلط اور انتہائی درجہ کی سوء ادبی ہے درحقیقت اوریا کا یہ قصہ ہی جس میں مودودی صاحب ''حضرت داؤد علیہ السلام کی خواہش نفس کا بھی دخل'' بتلاتے ہیں بالکل خلاف حق و تحقیق ہے، یہ یہودیوں کی من گھڑت اور پراز بہتان روایتیں ہیں جن کے لئے اسلامیات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

چنانچہ مفسر قرآن حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں:

قد ذکر المفسرون ھھنا قصۃ اکثرھا ماخوذ من الاسرائیلیات ولم یثبت فیھا عن المعصوم حدیث یجب اتباعہ (تفسیر ابن کثیر ص ۳۱ ج ۴)

اور کتاب الفصل میں حافظ ابومحمد بن حزم لکھتے ہیں:

وھذا قول صادق صحیح لا یدل علی شیء مما قالہ المستھزء ون الکاذبون المتعلقون لخرافات ولدھا الیھود (الفصل فی الملل والنحل ص ۱۴ ج ۴)

اسی طرح نسیم الریاض، شفاء، بحرالمحیط اور تفسیر کبیر میں اس تمام خرافات کو مردود قرار دیا ہے جس کو مودودی صاحب صحیح تسلیم کر کے حضرت داؤد علیہ السلام پر الزام تراش رہے ہیں۔

سترہواں نمونہ

مودودی صاحب نے تحقیقاتی عدالت میں جو تیسرا بیان دیا ہے اس میں لکھا ہے:

''یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مہدی کے متعلق کوئی خاص عقیدہ اسلامی عقائد میں شامل نہیں ہے اہل سنت کی کتب عقائد اس سے بالکل خالی ہیں'' (تیسرا بیان ص ۱۹)

حالانکہ امام سفارینی رحمۃ اللہ علیہ کے ''عقیدہ سفارینی'' میں تحریر ہے فالایمان بخروج المهدی واجب کماهو مقرر عند اهل العلم ومدون فی عقائد اهل السنة (ص ۸ ج ۲) ظہور مہدی پر ایمان لانا واجب ہے جس طرح کہ علماء کے نزدیک مقرر ہو چکا ہے اور اہل سنت والجماعت کی کتابوں میں درج ہو کر محفوظ ہو چکا ہے۔

اور شرح عقائد کی شرح نبراس میں ہے: تواترت الاحادیث فی خروج المهدی (ص ۵۴۴) ظہور مہدی میں احادیث متواتر ہیں۔ اور متواتر کا انکار اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

مندرجہ بالا کتب عقائد کے حوالجات کو سامنے رکھتے ہوئے مودودی صاحب کے اس بیان کو کہ ''اہل سنت کی کتب عقائد اس سے بالکل خالی ہیں'' ملاحظہ فرمائیں، کتب عقائد سے تو واضح ہو رہا ہے کہ ''ظہور مہدی'' پر ایمان لانا واجب ہے اور یہ عقیدہ اہل سنت کے عقائد میں شامل ہے اور ''ظہور مہدی'' کے متعلق جو احادیث روایت کی گئی ہیں وہ متواتر ہیں چنانچہ مسلم شریف، ترمذی شریف، ابوداؤد شریف، طبرانی، احمد، نعیم، حاکم میں ''ظہور مہدی'' کی یہ احادیث موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ امت میں سلف اور خلف کا ''ظہور مہدی'' پر اجماع رہا ہے آج تک علماء معتبرین اور ائمہ محدثین متقدمین میں سے کسی نے اس اجماع کی مخالفت نہیں کی اور علماء کرام نے اس کے اثبات میں مستقل کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ اس زمانہ میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ الخطاب المليح فی تحقيق المهدی والمسيح اور دوسرا رسالہ مؤخرة الظنون عن ابن خلدون اسی ظہور مہدی کے بارہ میں لکھے گئے ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ مودودی صاحب نے یا تو اپنی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے عدالت میں یہ بیان دے کر کہ ''مہدی کے متعلق کوئی خاص عقیدہ اسلامی عقائد میں شامل نہیں ہے'' علماء کو بزعم خود اس رسوائی سے بچا لیا جس کا سامان ان کے کہنے کے مطابق تحقیقاتی عدالت میں کیا جا رہا تھا یا پھر مودودی صاحب کے تبحر علمی کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود ان کی وسعت مطالعہ کا حدود اربعہ ہی اسی قدر رہے کہ حدیث وعقائد کی مروج اور متداول کتابوں سے بھی ان

کو واقفیت نہیں ہے اس وجہ سے انہوں نے یہ خلاف حقیقت اور غلط بیان دے کر علماء کو رسوائی سے بچانے کی بجائے اپنے علم کو رسوا کیا ہے۔

حرف آخر

یہ چند نمونے ہیں جن کو اس وقت پیش کیا جارہا ہے ورنہ داڑھی کی شرعی مقدار اور تملیک کے بغیر زکوۃ کی ادائیگی اور ہندوپاکستان کے مسلمانوں میں وراثت اور نکاح وغیرہ کے بہت سے مسائل پیش کئے جاسکتے ہیں ۔مودودی صاحب کے اسی قسم کے اجتہادات اور خودساختہ مسائل ہیں جن کی وجہ سے علماء کرام ان سے اختلاف رکھتے ہیں جن حضرات کو ابھی تک مودودی صاحب کے بارہ میں حسن ظن ہے وہ حضرات بھی خصوصیت کے ساتھ اس پر غور فرمائیں کہ انبیاء علیہم السلام اور ظہور مہدی وغیرہ کے بارہ میں جو نظریات مودودی صاحب نے پیش کئے ہیں کیا یہ جمہور اہل سنت کے عقائد ہیں؟

ایک بات یہ بھی انصاف کے ساتھ غور کرنے کی ہے کہ ایک طرف تو مودودی صاحب کی تحقیقات کا نتیجہ ہے اور دوسری طرف تمام امت کے مایہ ناز علماء اہل سنت والجماعت کی ہزار سالہ متفقہ تحقیق تو عقل خواہ معمولی سی ہی عقل ہو کیا یہ باور کرسکتی ہے کہ وہ سب غلطی پر اور مودودی صاحب حق پر ہوسکتے ہیں خصوصاً جبکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ان حضرات کے علم وفضل اور تقوی وطہارت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قرب ہونے کی وہ خصوصیات ہیں جن کا پاسنگ بھی آج کسی کو میسر نہیں آسکتا۔یہ کھلی دلیل ہے اس کی کہ ان کے خلاف کہنے والا سخت غلطی پر ہے اور اگر فرض محال کے طریقے پر برابر ہی کا درجہ دے دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ مودودی صاحب کے نظریات میں غلطی ممکن ہے یا نہیں، اگر نہیں تو وہ کون سی وحی ہے جو ان پر آکر اس کو صحیح بناتی ہے اور اگر ممکن ہے جیسے کہ تمام امت کے مقابلہ میں اسی کی توقع ہے تو پھر اس کا علاج بھی ہوسکتا ہے یا نہیں، کیا پوری دنیا میں تقوی والے ایسے علماء نہیں ملتے جن کو حکم بنا کر فیصلہ کردیا جاسکے۔ اگر واقعی دین کی طلب ہو تو یہ کوئی مشکل بات نہیں اور اگر مودودی صاحب خلوص سے آمادگی ظاہر

کردیں تو علماء متقین اب بھی بلاکسی معاوضہ لیے ان تمام مقامات کی اصلاح پیش کرسکتے ہیں جو سلف کی تحقیقات کے خلاف ہیں۔ پھر اگر قوت ایمانی جرأت وجوانمردی سے کام لے کر مودودی صاحب نے ان سے رجوع کرلیا تو سارا اختلاف دور ہوکر خلاف اسلام تمام باتوں پر عمل کر جد وجہد ہوسکتی ہے جس کا نتیجہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

ع بس اک نگاہ پر ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

اور ہمت نہ ہوتو پھر سوال ہے کہ اگر ان تمام باتوں کو جو اسلاف کے خلاف ہیں اشاعت سے روک دیا جائے اور صرف نفس اسلام کے خلاف باتوں کی اصلاح وتر دید کا کام کیا جائے تو کیا خدمت بلا تفرقہ نہ ہوگی اور زیادہ بہتر نہ ہوگی؟۔

اب رہی یہ بات کہ اختلاف نظریات کے باوجود بھی آئین اسلامی اور اقامت دین کی جدوجہد میں مودودی صاحب کا ساتھ دینا چاہئے ،اور اس حد تک ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے اول تو اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ جمہور اسلاف امت کے خلاف ایسے نظریات کا قائم رکھنا ہی کیا ضروری ہے جو اس اختلاف نظریات کو برداشت کیا جائے۔ مودودی صاحب کو ہی یہ مشورہ کیوں نہ دیا جائے کہ وہ ان نظریات سے رجوع کا اعلان کردیں جو اختلاف اور افتراق کا سبب بنے ہوئے ہیں،مودودی صاحب کو اگر''اقامت دین'' کی اہمیت پیش نظر ہے تو وہ جمہور اسلاف امت کے خلاف ہوکر اور ایسے نئے نئے مسائل ایجاد کر کے مسلمانوں میں غیر معمولی انتشار واختلاف میں اضافہ ہی کیوں کرتے ہیں،جن سے مسلمانوں کو قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا،بلکہ ان سے الٹا رہا سہا اتفاق واتحاد بھی ختم اور برباد ہوتا جارہا ہے۔اگر ان کو''اسلامی آئین'' کا احساس ہے تو وہ مختلف الخیال مسلمانوں کو اکٹھا کریں اور مذہب سے متعلق جمہور امت کے خلاف اپنے خاص نظریات کو منظر عام پر لانے سے گریز کریں جیسا کہ قائداعظم محمد علی جناح نے کیا تھا کہ عام طور پر وہ مذہبی اختلافات میں حصہ لینے اور رائے دینے سے گریز کرتے تھے اور اگر انہوں نے اس قسم کی کوئی رائے کبھی دی بھی تھی تو چونکہ ان کو صرف ایک دنیوی راہنما اور لیڈر سمجھا جاتا تھا اور انہوں نے مودودی صاحب کی طرح جدید کے ساتھ قدیم طریقہائے تعلیم سے کچھ کچھ

حصہ نہیں پایا تھا،اس لئے ان کی رائے مذہب پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی ۔بخلاف مودودی صاحب کے انہوں نے بقول خود ''دونوں کو چونکہ چل پھر کر دیکھا ہے''اس لئے دیکھا جا رہا ہے کہ ان کی رائے کو ان کے پیروکار مذہبی تحقیق سمجھتے ہیں اور ان کی غلط تحقیقات کی بھی تاویلات کرتے اور تائید کرتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض موجودہ اکابر نے محمد علی جناح کا تو ساتھ دیا تھا،مگر مودودی صاحب کا وہ ساتھ نہیں دیتے کیونکہ ان کا ساتھ دینے میں یہ بڑا مفسدہ ہے کہ عوام مودودی صاحب کے غلط نظریات کو علمائے کرام کے ساتھ دینے کی وجہ سے صحیح سمجھنے لگیں گے۔ اس لئے بحالت موجودہ نہایت ضروری ہے کہ مودودی صاحب کی اقامت دین کی جدوجہد سے بھی مسلمانوں کو علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا جائے تا کہ موصوف کے غلط نظریات کی تائید کر کے مسلمان اپنا مذہب اور اپنے عقیدے خراب نہ کر لیں ۔فقط

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ و الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ،آمین۔

سید عبدالشکور ترمذی عفی عنہ
مہتمم مدرسہ عربیہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا
۲۰رشعبان المعظم ۱۳۸۷ھ

فقیہ العصر مفتی سید عبد الشکور ترمذی قدس سرہ

”رہائشی تعمیرات کی شرعی حیثیت“

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

”رہائشی تعمیرات کی شرعی حیثیت“ کے عنوان سے تیس سال قبل روزنامہ جنگ ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء میں جناب رفیع اللہ شہاب صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں بعض آیات اور احادیث کی غلط تشریح کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ مکان اسی کا ہے جو اس میں رہائش پذیر ہے اور مکانات کا کرایہ سود میں شامل ہے یہ مضمون سراسر سوشلسٹ عناصر کے نظریات کا حامل وترجمان اور اسلامی نظریات اور اس کی تعلیمات کے سراسر خلاف تھا اس لیے ضرورت تھی کہ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے اور اس کی اغلاط کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے اور اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کی صحیح ترجمانی کی جائے اسی ضرورت کے پیش نظر حضرت اقدس فقیہ العصر مولانا مفتی سید عبد الشکور ترمذی قدس سرہ نے بروقت اس کا جواب تحریر فرما کر روزنامہ جنگ میں شائع کرایا۔ اب حضرت کا وہی مضمون عنوانات کے اضافہ کے ساتھ ہدیۂ قارئین ”مجلہ الحقانیہ“ ہے اس کی ضرورت وافادیت آج کے حالات میں کتنی ہے اس کا اندازہ اسے پڑھ کر لگانا مشکل نہیں ہے۔(ادارہ)

جنگ ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء میں عنوان بالا کے تحت (رفیع اللہ شہاب کے مضمون میں) بعض آیات واحادیث کی غلط تشریح کرتے ہوئے اس اصول کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مکان اس کا ہے جو اس میں رہائش پذیر ہے اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۹ کے لفظ ”عـفـو“ کا ترجمہ ضروریات سے زائد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”جو کچھ تمہاری ضروریات سے زائد ہے وہ تم دوسرے بھائیوں کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کر دو“۔

آیت قرآنی کا صحیح مفہوم

حالانکہ پوری آیت کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سوال کرنے پر کہ کیا خرچ کریں؟ ان کو بتلایا گیا کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

اور سوال کرنے پر جو زائد از ضرورت خرچ کرنے کو بتلایا گیا وہ حکم لازمی نہیں ہوسکتا

کیونکہ لازمی اور ضروری حکم تو بغیر پوچھے ہی بتلایا جاتا ہے اس لیے اس سوال کے جواب میں جو زائد از ضرورت خرچ کرنے کا ذکر اس آیت میں فرمایا گیا ہے اس پر عمل کرنا ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا اختیاری ہی ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ اس لفظ کے ترجمہ میں بڑی وسعت ہے مفسرین نے اس کا ترجمہ دوسری طرح بھی کیا ہے اور اس سے وہ مال مراد لیا ہے جس کا خرچ کرنا بار خاطر نہ ہو، اس معنی کے پیش نظر پوری آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو"۔ نیز تفسیر ابن کثیر میں "عفو" کا معنی ستھرا، پاکیزہ اور عمدہ مال بھی کیا گیا ہے، اور یہ معنی امام ربیع سے منقول ہیں، اس کے لحاظ سے آیت بالا کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا کی راہ میں جو خرچ کیا جائے وہ عمدہ مال ہو گھٹیا نہ ہو۔

شرعی احکام کا ساقط قرار پانا

اگر زیر نظر مضمون میں ذکر کردہ یہ معنی درست تسلیم کر لیے جائیں کہ جو کچھ ضروریات سے زائد ہو وہ دوسروں کو دے دیا کرو اور اس حکم کو اختیاری تعلیم کی بجائے لازمی مان لیا جائے تو اس معنی کی رو سے دوسری آیات واحادیث سے ثابت شدہ بہت سے احکام مثل زکوۃ وغیرہ کے ساقط ہو جائیں گے اور دوسری آیت کے بھی یہ معنی خلاف ہو جائیں گے، چنانچہ سورۃ بقرہ آیت نمبر ۳ میں ہے: "جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔

اور آیت ۲۶۷ میں ہے: "اے ایمان والو خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیا ہے"۔

اس طرح کی اور دوسری آیات میں بھی یہی مضمون ہے کہ اللہ نے جو مال عطا فرمایا ہے اور زمین میں سے جو کچھ پیدا کیا ہے اس مال اور پیداوار میں سے کچھ حصہ خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی تشریح حدیثوں میں کر دی گئی ہے کہ وہ کتنا حصہ ہے جس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا لازمی ہے۔

اگر ضروریات سے زائد کل مال دوسروں کو دے دینا ضروری ہو تو حدیثوں میں اس حصہ کو معین کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی اور ایسی سب حدیثیں جن میں مال کے حصہ معینہ کے

خرچ کرنے کا حکم بطور فرض کے دیا گیا ہے بے ضرورت اور نا قابل عمل قرار پائیں گی، حالانکہ ان احادیث پر تمام امت آج تک عمل پیرا ہے اور شریعت اسلامیہ کا متفق علیہ اجماعی مسئلہ ہے کہ شرائط معلومہ کے ساتھ قابل زکوٰۃ اموال کے ایک معین حصہ ہی کا ادا کرنا فرض ہے، ضروریات سے زیادہ کل مال کا خرچ کرنا فرض نہیں ہے، اگر زائد از ضرورت کل مال کا خرچ کرنا لازمی حکم ہوتا ہے تو مال کے مقررہ حصہ کا بطور زکوٰۃ کے ادا کرنا فرض نہ ہوتا بلکہ کل مال کا خرچ کرنا فرض ہوتا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس آیت ۲۱۹ کے حوالہ سے امت کو ضرورت سے زیادہ کل مال کے خرچ کرنے کی ہدایت فرماتے اور زکوٰۃ میں ادا کرنے کے لیے حصے مقرر نہ فرماتے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہوگا کہ آیت ۲۱۹ کا جو مفہوم زیر نظر مضمون میں بتلایا گیا ہے یہ اخلاقی نوعیت کی استحبابی تعلیم تھی کہ جس مسلمان کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ کوئی چیز ہو تو وہ اس کو دوسرے مسلمان بھائی کو مفت دے دے اس لیے کہ ایسا کرنے پر اگر ہر شخص کو قانوناً مجبور کر دیا جاتا تو ضروریات سے زیادہ بقدر نصاب مال کا کوئی مسلمان بھی مالک نہ ہو سکتا اور کسی مسلمان پر بھی زکوٰۃ فرض ہونے کی کوئی صورت ممکن نہ رہتی اور وراثت و وصیت کے احکام کا بھی اس جبری قانون سے متاثر ہونا لازم آتا۔

ضرورت سے زائد مال کا ملک میں رکھنا

سورۃ نساء آیت ۲۰ میں شوہر کو فرمایا گیا ہے:

''تم اس کو (یعنی بیوی کو) ایک ڈھیر کا ڈھیر مال دے چکے ہو تو بھی اس سے کچھ واپس نہ لو'' معلوم ہوا کہ شوہر ضرورت سے زیادہ مال اور وہ بھی ڈھیر کے ڈھیر کا مالک تھا اور ڈھیر کا ڈھیر مال ضروریات میں داخل نہیں ہوتا، اس سے ثابت ہوا کہ ضروریات سے زیادہ مال ملک میں رکھنا درست ہے جو اسے مہر وغیرہ کے موقع پر کام آ سکے، اگر ضرورت سے زیادہ مال رکھنا ممنوع ہوتا تو ایسے موقعوں پر ڈھیر کا ڈھیر خرچ کرنے کے لیے کسی کے پاس کیسے جمع ہو سکتا تھا۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو فرمایا کہ'' تمہارا اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ جانا اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج اور دوسروں کے

سامنے ہاتھ پھیلانے والا چھوڑ جاؤ‘‘ (بخاری ج ۱)

اس حدیث سے واضح ہے کہ غنی مالدار رہنا اسلام میں نہ صرف یہ کہ ممنوع نہیں بلکہ صاحب مال لوگوں کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنے وارثوں کے لیے اس قدر مال چھوڑ جائیں کہ وہ اس کو حاصل کر کے مالدار اور غنی بن جائیں۔

کسی کا مال بدوں اس کی خوش دلی کے حلال نہیں

قرآن واحادیث کی رو سے کسی اموال میں مالک کی رضامندی کے بغیر جبراً کسی طرح کا تصرف کرنا ظلم، قطعاً حرام اور قرآن حدیث کی صریح تعلیمات کے خلاف ہے۔ قرآن کی آیت بقرہ ۱۸۷ میں ہے:

’’مت کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں غلط طریقہ سے اور ہوسکتا ہے کہ کسی یتیم اور نابالغ کا بھی اس میں حق ہو‘‘۔

پھر تو ناحق تصرف کرنے والا سورۂ نساء کی آیت ۹ کا پورا مصداق ہے کہ ’’جو لوگ یتیموں کے مال کو ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں‘‘ اور حدیث میں واضح ہدایت موجود ہے کہ کسی شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

غیر شرعی فیصلہ

اس لیے یہ فیصلہ اسلامی نہیں ہے کہ ہر خاندان ایک مکان اپنی ملکیت میں رکھ سکتا ہے اور ایک سے زائد مکان حکومت اپنے تصرف میں لا کر ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کر دے۔

بالفرض اگر اس اصول کو درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہ اصول صرف مکانات کے ساتھ ہی خاص نہیں ہونا چاہیے بلکہ نقد، زیور، خوراک پوشاک، فرنیچر وغیرہ تمام خانگی سامان آرائش کو بھی حاوی ہونا چاہیے اور ایک مکان سے زائد مکانات کی طرح ہر شخص کے لیے ایک دو جوڑا ضروری کپڑوں کا اور دو ایک ضروری برتنوں اور ایک ایک چارپائی اور وہ بھی بہت ہی معمولی قیمت اور گھٹیا قسم کے (کیونکہ ضرورت تو معمولی اور گھٹیا قسم کے سامان سے بھی پوری ہوسکتی ہے) رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے اس کے علاوہ تمام زائد سامان واسباب کی تقسیم دوسرے ضرورت مندوں پر کر دینی لازم ہوگی۔

قابل توجہ

جن لوگوں کے نزدیک قرآن کریم کا یہ اصول ثابت ہے معلوم نہیں کہ وہ اس کو صرف مکانات کے بارہ میں ہی کیوں جاری کرنا چاہتے ہیں دوسرے خانگی اسباب وسامان معیشت بلکہ سامان تعیش کے بارہ میں اس اصول کو کیوں جاری نہیں کرنا چاہتے ۔حالانکہ ان لوگوں کے گھر بھی زائد از ضرورت سامان سے بھرے ہوتے ہیں ۔ایسے لوگوں کے نہ تو لباس میں ہی اسلامی سادگی کے آثار نظر آتے ہیں اور نہ ہی کھانے پینے کے اندر ہی سادہ طرز کی کوئی جھلک محسوس ہوتی ہے بلکہ لباس اور خوراک میں ضرورت سے زیادہ تفاخر اور تکلف کی نمائش کا اہتمام ہے اور گھریلو سامان کے جمع کرنے میں بھی ضرورت کی حد سے کہیں زیادہ زینت وآرائش کی خاطر اسراف اور فضول خرچی کی حد تک خرچ کیا جاتا ہے اور اس کو اپنے تسلیم شدہ اس اصول کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔

پھر ایک مکان میں بھی کچی اور سادہ تعمیر سے ضرورت پوری کی جاسکتی ہے مگر پختہ اور سیمنٹڈ ،عالیشان مکان کو ضروری سمجھا جاتا ہے حالانکہ پختہ مکان اور پھر اس قدر اونچا اور وسیع زائد از ضرورت ہے اور خود ان لوگوں کو تسلیم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں جہانوں کے سردار ہونے کے باوجود ایک نہایت سادہ سے مکان میں رہائش پذیر تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہر ایک خاندان کے لیے ایک مکان اپنی ملکیت میں رکھنے کی جو اجازت دی جائے گی اس کے لیے ایک نہایت ہی سادہ مکان جس طرح کے مکان میں دونوں جہانوں کے سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سادہ زندگی بسر فرماگئے ہیں معیار قرار دیا جائے گا، یا آج کل کے سرمایہ داری سے نفرت کا وعظ کرنے والے اور ضروریات سے زائد ہر چیز دوسروں کو دینے کی دعوت دینے والے سوشلسٹوں کی عالیشان بلڈنگ کہ جو سرمایا دارانہ ذہنیت کی حسین، دلربا اور دلکش تصویر بنی ہوئی دعوت نظارہ دے رہی ہوتی ہے کو معیار بنایا جائے گا پھر دیہات اور قصبات کے مکانات اور لاہور اور کراچی وغیرہ کے مکانات میں سے کتنے بڑے مکان اور کوٹھی بنگلہ کے کس ڈیزائن اور کس قسم کے میٹیریل سے بنی ہوئی عمارت مثالی سمجھی جائے گی اور اس سے زیادہ کو زائد از ضرورت سمجھا جائے گا اور وہ قانوناً ممنوع ہوگی۔

ہر سمجھدار آدمی غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس معاملہ میں ایک ہی طرح کی طرز تعمیر کا سب کے لیے متعین کرنا عملی طور پر تقریباً ناممکن ہے اور امتیاز رکھنے کو نا جائز کہا جارہا ہے۔ پھر اگر لاہور جیسے شہر میں ایک مکان کے ملکیت میں رکھنے کی اجازت ہو تو اتنی ہی مالیت کے متعدد مکانوں کا قصبات اور دیہات میں بنالینا اور ان کو ملکیت میں رکھنا کیوں اور کس دلیل سے ناجائز اور ممنوع قرار دیا جاسکے گا اور اگر مالک کی گزر اوقات کا ذریعہ مکانات کا کرایہ ہو اور وہ اس کے ذریعہ زندگی گزار رہا ہو پھر تو ان کو زائد از ضرورت بھی کسی جگہ اور کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔

ایسی حالت میں تو یہ قانون کہ صرف ایک مکان ملکیت میں رکھنے کی اجازت ہے عقلاً ونقلاً کسی طرح بھی اور کسی جگہ بھی درست نہیں ہوسکتا۔

ملازم پیشہ طبقہ کے لیے مشکلات

اس کے علاوہ طبقہ ملازمین کے لیے اس اقدام سے کہ مکان اس کا ہے جو اس میں رہائش پذیر ہے کس قدر مشکلات پیش آنے کا امکان ہے۔ اس سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ طبقہ اپنے ذاتی مکانات جو ان کی ملک میں ہوں کرایہ پر نہیں دے سکے گا اس لیے کہ اس کو کرایے پر دینا بے سود ہوگا اور مکان اس کا ہوگا جو اس میں رہائش پذیر ہے لہٰذا اسی طبقہ کے ہاتھ سے ان کے مملوکہ مکانات نقل کیے جائیں گے بلکہ اس اقدام کے بعد جائے ملازمت پر کوئی مکان کرایے سے ان کو حاصل نہیں ہوسکے گا کیونکہ ضرورت سے زیادہ کسی کو مکان بنانے کی اجازت ہی نہ ہوگی تو پھر اس طبقہ کے لیے مکانات کا کیا انتظام ہوگا؟۔

اگر حکومت ان کے مکانات کی ذمہ داری قبول کرلے اور ملازمین کے لیے مکانات تعمیر کرکے ان کی رہائش کا انتظام کرلے تو علاوہ اس کے کہ اس طرح سرکاری خزانہ پر زبردست مالی بوجھ پڑ جائے گا ان ملازمین کے اپنے ذاتی مکانات کا کیا حشر ہوگا ان کو حکومت ضبط کرکے ان پر غاصبانہ قبضہ کرلے گی اس سے تحفظ کی کیا صورت ہوگی اور ملازم کی برخواستگی یا مدت ملازمت کے پورا ہونے کے بعد اس ملازم اور اس کے اہل وعیال کے لیے رہائش کا کیا انتظام کیا جائے گا؟۔

حدیث سے غلط استدلال

حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول مضمون نگار بالفرض اگرایک صحابی کا اس لیے سوشل بائیکاٹ کردیا تھا کہ اس نے اپنے بھائیوں پر امتیاز حاصل کرتے ہوئے کچھ ضرورت سے زائد عمارت تعمیر کرلی تھی تو پھر ایک پختہ بلڈنگ اور عالیشان مکان بھی ضروریات سے زائد ہی ہے عمارت کے پختہ اور سمینٹڈ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔رہائش کی ضرورت کچی اور سادہ عمارت سے بھی پوری ہوسکتی ہے۔

اس سادگی کی تعلیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو دی تھی جنھوں نے اپنے مکان کو پختہ اور بلند بنالیا تھا اس عملی مثال میں اس اصول کی طرف ادنیٰ سا بھی اشارہ نہیں ہے کہ مکان اس کا ہے جو اس میں رہائش پذیر ہے اور اس غاصبانہ طرز عمل کا ثبوت تو اس سے کسی طرح بھی نہیں ہوسکتا کہ ایک سے زائد مکان حکومت اپنے تصرف میں لے کر ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کردے جیسا کہ زیرتبصرہ مضمون میں اس غصب وظلم کے ثابت کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔کیا مضمون نگار یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ اس مثالی واقعہ میں حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی سے وہ مکان لے کر کسی دوسرے ضرورت مند کو دے دیا تھا حقیقت واقعہ یہ ہے کہ وہ زائد از ضرورت مال اور مکان ان صحابی کے قبضہ میں ہی رہنے دیا گیا۔نہ تو ان سے لے کر کسی اور کو دیا گیا تھا اور نہ ہی خود ان کو کسی اور کو دینے کا حکم صادر فرمایا گیا تھا۔صرف عمارتوں میں سادگی کی تعلیم دی گئی تھی۔

سادگی کی تعلیم

ابوداود کے حوالہ سے جس حدیث کا تذکرہ مضمون نگار نے کیا ہے اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہورہا ہے کہ تعمیرات پھر خواہ مکان ہو یا دکان یا کوئی اور عمارت ہو میں سادگی کو اختیار کیا جائے۔عمارت میں فضول خرچی کرنے کو وبال فرمایا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک سے زائد مکان فضول خرچی میں شمار ہوگا۔

حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکانات کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ یہ مکانات چھ چھ سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لمبے تھے چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہوکر چھت کو

چھولیتا تھا۔دروازوں پر کمبل کا کپڑا پڑا رہتا تھا۔راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے۔(سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ،شبلی نعمانی ص۲۸۲ج ۱)

واقعہ کی اصل حقیقت

اس سادگی کے خلاف ایک صحابی کا طرز عمل ملاحظہ فرما کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اعراض فرمایا ان صحابی نے اپنے بے نظیر جذبہ محبت سے متاثر ہو کر بغیر کسی حکم کے اپنی اصلاح اور نفس کشی کی خاطر اس پختہ عمارت کو گرا کر خوشنودی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تمغہ حاصل کرلیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعراض یقیناً تادیب وتکمیل اخلاق کی غرض سے تھا۔ اور یہ اخلاقی تعلیم بھی لازمی تعلیم نہ تھی ورنہ آپ زبان مبارک سے تنبیہ کے ساتھ اس کو گرانے کا حکم صادر فرماتے اور صرف بے التفاتی کے ذریعہ ہی ناپسندیدگی کے اظہار پر اکتفاء نہ فرماتے اور اس نہایت لطیف انداز تربیت اور محبوبانہ طرز تادیب کو سوشل بائیکاٹ سے موسوم کر دینا یہ صرف اس زمانہ کی ایجاد اور اس کا بہت ہی غلط ،بے جا استعمال ہے۔کسی ایک صحابی کو بھی ان سے سلام وکلام سے منع نہیں کیا گیا تھا۔

قیاس فاسد

واقعہ کی اس حقیقت سے اعراض وروگردانی کر کے ہمارے زمانہ میں یہ لوگ پختہ اور بلند عمارتوں کو تو اسلامی سادہ طرز زندگی کے خلاف نہیں سمجھتے مگر ایسے لوگوں کی طرف سے اسلامی اصول کے خلاف مکان کے کرایہ کو سود کی تعریف میں اپنے قیاس فاسد سے داخل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے چنانچہ زیر نظر مضمون میں بھی لکھا ہے:

’’اگر سرمایے کی ایک خاص مقدار بینک میں جمع کرا کے اس کا نفع حاصل کیا جائے تو وہ بالاتفاق سود تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے اگر خاص مقدار سے کوئی مکان خرید کر کرایہ پر اٹھا دیا جائے تو اس کا کرایہ سود کی تعریف سے خارج نہ ہوگا‘‘۔

بینک میں جمع شدہ رقم کے منافع پر مکان کے کرایہ کو قیاس کر کے سود کی تعریف میں داخل کرنا عقلاً ونقلاً قطعاً غلط اور اسلامی اصول سے بے خبری پر مبنی ہے،اس لیے کہ مفروضہ مثال

میں نقد رقم کے معاوضہ میں اپنی جمع شدہ رقم سے مکان خریدنے کے بعد اس کا جو کرایہ وصول ہوگا وہ نقد رقم کا نفع نہیں ہوگا بلکہ مکان کا نفع ہوگا اور جنس تبدیل ہوجانے اور شرائط سود نہ پائے جانے کی وجہ سے سود کی تعریف سے خارج ہوگا یہی وجہ ہے کہ مثلاً ایک لاکھ روپیہ کا مکان خرید کر سوا لاکھ میں بیچنا اور پچیس ہزار اس پر نفع حاصل کرنا سود اور نا جائز نہیں ہے۔

مضمون نگار کی منطق کی رو سے تو مذکورہ مثال میں مکان کی بیع کا نفع بھی نا جائز اور سود ہونا چاہیے حالانکہ اس کو سوائے ان مکہ والوں کے اور کوئی بھی مسلمان صحیح تسلیم نہیں کرسکتا جنہوں نے بیع اور سود کو برابر کہا تھا، حالانکہ بیع کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام (سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۷۴) اور اگر مکان کے کرایہ کو سود کی تعریف میں داخل کیا جائے گا تو پھر دکانوں کے کرایہ کا کیا حکم ہوگا؟ اور برتن وغیرہ میز، کرسی نیز فرنیچر شامیانے کو کرایہ پر دینا بھی سود میں شامل ہو کر نا جائز ہو جائے گا۔

اسی طرح لاری، کار، ویگن، ریل، ہوائی جہاز وغیرہ کا کرایہ بھی سود قرار پائے گا۔

آخری گزارش

اب جبکہ ملک عزیز میں اسلامی نظام کی طرف پیش رفت جاری ہے مناسب ہے کہ ایسے وقت میں اسلامی تعلیمات کے پیش نظر سادہ زندگی کو اپنایا جائے تعمیرات کے ساتھ خوراک و پوشاک میں بھی اسلامی سادہ وضع قطع کو اختیار کیا جائے اور جہاں تک ہوسکے اسراف وفضول خرچی سے پرہیز کیا جائے مگر اس مقصد کے لیے کسی سوشلسٹ یا سرمایہ دار ملک کے تجربہ سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دینے کی بجائے چودہ سو سالہ مسلمہ اسلامی اصولوں سے رہنمائی حاصل کی جائے اور قرآن وحدیث کی من مانی غلط تشریحات کے ذریعہ متفقہ اجماعی مسائل کو موضوع بحث بنا کر ملت اسلامیہ میں ذہنی انتشار سے کلی طور پر پرہیز کیا جائے۔

مفتی محمد عبداللہ چنیوٹی

احکام القرآن مفتی عبدالشکور ترمذی کا منہج

تحقیقی جائزہ (قسط ۲۹)

فصل دوم

تقابلی جائزہ

کسی بھی تالیف کی جامعیت وانفرادیت معلوم کرنے کیلئے اس موضوع پر کی گئیں تالیفات کے ساتھ ان کا تقابل کیا جاتا ہے، جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کون سی تالیف علمی تحقیقات کے حوالہ سے دیگر تالیفات سے منفرد ونمایاں ہے۔

احکام القرآن للتھانوی کا منہج واسلوب چونکہ منفرد اور بہت جامع ہے اس کی انفرادیت اور جامعیت کا اندازہ کرنے کیلئے چند دیگر احکام القرآن کے موضوع پر ہونے والی تالیفات کے ساتھ جائزہ لیا جاتا ہے۔

تقابلی جائزہ کیلئے جو تالیفات احکام القرآن کے موضوع پر میسر ہوسکیں ان کے اسماء درج ذیل ہیں:

(۱)احکام القرآن للشافعی (۲)الجامع لاحکام القرآن للقرطبی (۳)احکام القرآن للجصاص (۴)احکام القرآن لابن العربی (۵)التفسیرات الاحمدیہ ملاجیون (۶)الاکلیل فی استنباط التنزیل للسیوطی (۷) نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام للقنوجی (۸) روائع البیان فی تفسیر آیات الاحکام للصابونی۔

تقابلی جائزہ کیلئے مفتی عبدالشکور ترمذی کے احکام القرآن سے پانچ آیات کا انتخاب کیا گیا جس میں دو آیات قرآن مجید کی دوسری منزل کے مطبوعہ حصہ سے لی گئیں اور ان کا تقابل دیگر مذکورہ بالا تالیفات کے اسی متعینہ سے کیا گیا جبکہ تین آیات قرآن مجید کی آخری منزل جوفی

الحال غیر مطبوعہ مسودہ کی صورت میں جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا کے کتب خانہ میں موجود ہے سے لی گئیں اوران کا تقابل صرف مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے تالیف کردہ حصہ سے کیا گیا تا کہ یہ بھی معلوم ہوجائے کہ مفتی عبدالشکور ترمذی نے مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے جس مفوضہ حصہ کا تکملہ لکھا اس میں کتنا اضافہ فرمایا۔

احکام القرآن مفتی عبدالشکور ترمذی

قوله تعالٰی :فبعث اللّٰه غرابا یبحث في الارض لیریه کیف یواری سوأة أخیه قال یویلتٰی اعجزت ان اکون مثل هذاالغراب فأواری سوأة أخي فاصبح من النٰدمین.

وهوالاصل في سنة دفن الموتی. وهوفرض علی الکفایة ان امکن قال ابن عباس وابن مسعود ومجاهد والسدی وقتادة والضحاک رضی الله عنهم:لم یدر کیف یصنع به حتی رای غرابا جاءیدفن غرابا میتا،وفي هذادلیل علی فسادماروی عن الحسن انهما رجلان من بني اسرائیل لانه لوکان کذلک لکان قد عرف الدفن بجریان العادة فیه قبل ذلک وهوالاصل فی سنة دفن الموتٰی وقال الله تعالٰی:"ثم اماته فاقبره" وقال تعالٰی:" الم نجعل الارض کفاتا احیاء وامواتا".

دفن الموتٰی فرض علی الکفایة علٰی جمیع الناس

فصارذلک سنة باقیة في الخلق وفرضاعلٰی جمیع الناس علی الکفایة من فعله منهم سقط عن الباقین فرضه واخص الخلق به الاقربون ثم الذین یلونهم من الجیرة ثم سائر الناس المسلمین وهوحق الکافرین ایضاً الخ.

الاستحباب فی القبر سعته واحسانه

ویستحب فی القبر سعته واحسانه لما رواه ابن ماجه عن هشام بن عامر رضی الله عنه قال :قال رسول الله ﷺ:"احفروا واوسعوا واحسنوا"

اللحد افضل من الشق عندنا

قیل :اللحد افضل من الشق عندنا،فانه الذی اختاره الله لرسوله ﷺ .الخ، قال الشیخ المحقق المحدث الدهلوی: ان کان المراد بضمیر الجمع فی " لنا "المسلمون ولغیرنا الیهود والنصاری مثلا، فلاشک انه یدل علٰی افضلیة اللحد بل علٰی کراهة غیره (لعل علتها التشبه بالغیر.ش)وان کان المراد لغیرنا الامم السابقة ،ففیه اشعار ایضا بالافضلیة .وعلٰی کل تقدیر لیس اللحد واجبا والشق منهیا عنه والا لما کان یفعله ابو عبیدة وهولایکون الا بامر من الرسول وتقریر منه ،وایضا لم یتفقوا علٰی ان ایهما جاء اولا عمل عمله فهذا من الاختیارات دون السنن ای اللحد هو الذی نوثر ونختار والشق اختیار من قبلنا. (جاری......)

مولوی محمد عمران طیب سرگودھا

آہ ہمارے استاذ جی

خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک اس شہر میں سب کچھ ہے بس اک تیری کمی ہے

استاذ جی آپ تو اللہ کے ولی ہیں! ہمارے لیے بھی دعا فرمادیں کہ اللہ ہمیں بھی اپنا ولی بنالے ..... ہیں، یہ کیا کہا آپ نے؟ آئندہ اس بات کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائیں، استاذ جی نے قدرے سخت انداز میں کہا۔

میری یہ گفتگو استاذ جی رحمہ اللہ سے اس وقت ہوئی تھی جب کہ مجھے آئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا، اس سے پہلے تبلیغی مرکز سرگودھا میں استاذ جی کا بیان سننے کا اتفاق ہوا تو بہت پسند آیا، ایک اچھوتا اور منفرد انداز تھا استاذ جی کا جس کی وجہ سے وہ اپنی بات کو بہت سادہ اور آسان طریقہ سے حقیقی مثالوں سے سمجھا دیا کرتے تھے، بیان کے دوران پورا مجمع ساکت وخاموش اور ہمہ تن گوش ہوتا تھا، جس شخصیت کا میں تعارف کروانے چلا ہوں ان کا نام نامی اسم گرامی ہے حضرت قاری حافظ محمد حنیف صاحب رحمہ اللہ جنہوں نے استاذ جی کے نام سے شہرت پائی، حضرت کا بچپن رائے پور انڈیا میں گذرا جہاں انہوں نے بڑے بڑے بزرگوں کی صحبت اٹھائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی، آپ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت تھے اور آپ کا شمار صاحب کشف وصاحب بصیرت بزرگوں میں تھا، تقریباً ۷۵ سال پہلے انڈیا سے سیدھا سرگودھا تشریف لائے اور جامع مسجد طوبیٰ پٹھانوں والی بلاک نمبر ۸ کو اپنا مسکن بنایا جو کہ اس وقت چند فٹ پر مشتمل ایک تھڑے کی شکل میں تھی، یہیں سے آپ نے اپنا تبلیغی کام شروع کیا اور سب سے پہلا گشت کیا، آپ کا شمار ان لوگوں میں تھا جنہوں نے سرگودھا میں تبلیغ کے کام کا آغاز کیا، چونکہ آپ کا وقت حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ بھی گذرا اس لیے آپ کی زندگی پر ان کے نقوش واثرات نمایاں تھے، آپ نے اپنے بیانات میں کبھی کوئی اختلافی بات نہیں فرمائی بلکہ فکر اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی

طرح امت متفق ومتحد ہوجائے جس کی وجہ سے اپ ہر ایک کی دلجوئی فرماتے تھے اور ہر ایک کو اپنے حسن سلوک سے دین پر لانے کی کوشش فرماتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ باپ کے بھی راز دار ہوتے تھے اور بیٹے کے بھی، خاوند کے بھی اور بیوی کے بھی، لیکن کسی ایک کی بات دوسرے کو نہ بتاتے بلکہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کا بہت آسان حل تجویز فرما کر سب کو آپس میں پیار و محبت اور اتفاق کی تعلیم دیتے تھے، میں نے تقریباً ساڑھے چار سال کا عرصہ یہاں پر استاذ جی کی خدمت اور صحبت میں گذارا، میں نے استاذ جی کی طبیعت اور مزاج کا اثر مسجد کی انتظامیہ اور یہاں کے لوگوں میں بھی پایا کہ ماشاء اللہ ائمہ و مؤذنین، علماء کرام اور دین والوں کی عزت وقدر کرنے والے سلجھے ہوئے اور سنجیدہ لوگ ہیں، جس کی وجہ سے مسجد کا ماحول بھی الحمدللہ پر سکون ہے، نیز سرگودھا شہر کا پہلا اور پرانا تبلیغی مرکز ہونے کی وجہ سے بہت سے اللہ والوں کا یہاں قیام رہا اور تشریف آوری ہوتی رہی اس لیے مسجد کے ماحول میں روحانیت کا اور سکون واطمینان قلب کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔

استاذ جی رحمہ اللہ کی منفرد خصوصیات میں سے ایک خصوصیت خدمت قرآن کریم بھی ہے، جب سے آپ یہاں تشریف لائے آپ نے قرآن کریم پڑھانا شروع کیا اور آخر عمر تک سخت بیماری کے آخری چند دنوں کے علاوہ آپ بڑی جانفشانی کے ساتھ قرآن کریم پڑھاتے رہے، تقریباً چوتھی یا پانچویں نسل آپ سے پڑھ رہی تھی، اس لیے آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے جو دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں، قرآن کریم سے آپ کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا اس کے بغیر آپ کو چین نہ آتا تھا، یہی آپ کی غذا اور یہی آپ کا علاج تھا، اسی وجہ سے آپ اپنے کسی رشتہ دار یا کسی بیٹی کے ہاں رات نہ ٹھہرتے تھے کہ صبح بچے آئیں گے اور میں نہ ہوں گا تو ان کا سبق ضائع ہوگا اور قیامت کے دن مجھ سے اس کا سوال ہوگا اور اگر بیماری کی وجہ سے ان کو یہاں سے دور کسی بیٹے کے ہاں رکھا جاتا تو پھر کسی نہ کسی کو لے کر چپکے سے پہنچ جاتے حتیٰ کہ ہسپتال میں داخل ہونے کے دنوں میں بھی اجازت لے کر آتے اور پڑھا کر پھر ہسپتال چلے جاتے، آپ نے اپنے حج وعمرہ یا تبلیغی سفر کے علاوہ ستر سالوں میں کبھی بھی چھٹی نہ کی، فجر کی

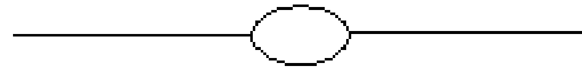
اذان سے پہلے خود بھی تشریف لے آتے اور بچے بھی آ جاتے اور فجر کی نماز کے ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد تک پڑھاتے ، اسی طرح ظہر سے پہلے ایک بجے سے تقریباً چار ساڑھے چار بجے تک پڑھاتے ، آپ کے پڑھانے کا انداز بھی بہت عمدہ تھا بچوں کو ہر ہر موقعہ کی مسنون دعائیں ، وضو نماز وغیرہ کے فرائض وسنن، مستحبات وآداب اور نواقض ، نیز نماز و نماز جنازہ کا عملی طریقہ مختلف جماعتیں بنا کر اجتماعی طور پر سکھاتے اور ان جماعتوں میں مسابقت اور مقابلہ کی فضا قائم فرماتے ، مجھے یہاں کا ماحول اس وجہ سے بھی بہت پسند آیا کہ یہاں کے لوگ استاذ جی کے شاگرد ہونے کی وجہ سے قرآن پاک اور نماز وغیرہ اچھی طرح سے پڑھنا جانتے ہیں ۔

بہر حال استاذ جی ایک جامع صفات وکمالات شخصیت کے مالک تھے اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ، آپ کی شخصیت اور کمالات کا احاطہ کرنے کے لیے ذہن وقلم ساتھ نہیں دیتے ، عاجزی وانکساری ، تواضع اور نیز حلم ووقار میں اپنی مثال آپ تھے ، تمام عمر اپنے کپڑے خود اپنے ہاتھ سے دھوتے ، فرماتے تھے کہ اگر میں کسی اور کے ہاتھ کا دھلا ہوا کپڑا پہن لوں تو نماز میں میرا دل نہیں لگتا ، امت کے لیے خیر خواہی اور دور اندیشی کا ایک واقعہ بطور مثال ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو کر عرض کرنے لگا کہ میرے والد نماز نہ پڑھتے تھے ، ساری زندگی کی نمازیں ان کے ذمہ ہیں اور وہ انتقال کر چکے ہیں اور میں ان کی طرف سے نمازوں کا فدیہ دینا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس یہ (تقریباً) انیس ہزار روپے ہیں ان کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں اس لیے میں پریشان ہوں کہ کیا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ بھائی میں بھی مستحق زکوۃ ہوں لاؤ یہ مجھے دو ، آپ نے اس سے وہ رقم لے کر دوبارہ اس کو دیدی اور فرمایا کہ یہ میری طرف سے آپ کو ہدیہ ہے ، اور پھر اس سے بطور فدیہ کے لے کر اس کو ہدیہ کر دی ، اس طرح کئی مرتبہ کے بعد آخر میں پھر وہ رقم اس کو لوٹا دی جس کی وجہ سے اس کا مسئلہ بھی حل ہو گیا اور رقم بھی اس کے پاس ہی رہی ۔

استاذ جی کو جب میں دیکھتا تھا تو میرے ذہن میں استاذ جی کی مثال اس پھل دار درخت جیسی آتی تھی کہ جو لوگوں کی سختیاں اٹھا کر اور ان کی تکالیف کو برداشت کر کے بھی ان کو ثمرہ

وفائدہ پہنچاتا ہے،خود دھوپ میں جل کر اوروں کے لیے سایہ اور راحت کا سامان مہیا کرتا ہے، فضا کی آلودگی کو اپنے اندر جذب کر کے صاف ستھرا اور پاکیزہ ماحول عطا کرتا ہے، اور اسی طرح استاذ جی کو دیکھ کر میرے ذہن میں سورۃ النحل کی آیت مبارکہ ومنکم من یرد الی ارذل العمر لکی لا یعلم بعد علم شیئا گھوم جاتی تھی جس کا مطلب ہے کہ ہم تم میں سے بعضوں کو ارذل یعنی نکمی عمر کی طرف لوٹا دیتے ہیں تا کہ وہ جاننے کے بعد کچھ بھی نہ جانے، اس سے مراد بڑھاپے کی عمر ہے کہ جس میں آدمی کے دماغ اور جسم کے اعضاء مختل ہو جاتے ہیں، زندگی بھر سب کچھ جاننے کے باوجود اس وقت آدمی کو کچھ پتہ نہیں رہتا، لیکن حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید پڑھنے والے کی یہ حالت نہیں ہوتی، یعنی اس کی عقل خراب نہیں ہوتی بلکہ قرآن مجید کی برکت سے اس کو اور جلا ملتی ہے اور اس میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے، چنانچہ استاذ جی اور بہت سے اللہ والوں کو اس کا مصداق پایا، استاذ جی اگر چہ اسی سے نوے تک کی دھائی سے گذر رہے تھے مگر ان کی عقل وسمجھ نیز قدر ومنزلت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا اور آخری دنوں میں جب زیادہ بیمار ہوئے تو اگر چہ بیماری کے اثر سے کسی وقت شعور کم ہوتا تھا مگر اس میں بھی لاشعوری طور پر کبھی نماز اور کبھی تلاوت قرآن کریم اور کبھی جماعتوں سے بیانات فرماتے اور کبھی بچوں کو پڑھاتے تھے اور جب شعور صحیح ہوتا تو مزاح بھی فرماتے تھے۔

استاذ جی ایک عرصہ سے شوگر اور عارضہ قلب میں مبتلا تھے، آخری دنوں میں جب بیماری نے شدت اختیار کی تو کافی دن ہسپتال میں رہے، انہی دنوں میں استاذ جی نے اپنے بیٹے حافظ ابوذر صاحب سے فرمایا کہ زندگی بھر میں نے یہ کوشش کی ہے کہ میری وجہ سے کسی چڑیا کے بچے کا دل بھی نہ دکھے، میں نے زندگی کیسی گذاری ہے اس کا فیصلہ میرا جنازہ کرے گا، اگر تم دیکھو کہ لوگ میری تعریف کر رہے ہیں تو اس پر اللہ کا شکر کرنا اور اگر دیکھو کہ میری برائی بیان کر رہے ہیں تو میرے لیے استغفار کرنا، انہی دنوں میں عیادت کے لیے جب ہسپتال میں میرا جانا ہوا تو ایسی سخت تکلیف میں تھے کہ دیکھی نہ جاتی تھی اس کے باوجود آیت مبارکہ ویحذرکم اللہ نفسہ واللہ رؤف بالعباد بار بار پڑھتے تھے جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالی تمہیں اپنی ذات



سے ڈراتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر مہربان ہے، اور وصال کے دن تو صبح سے واللہ رؤف بالعباد ہی کاورد رہا اور صبح ہی اپنے پوتے بھائی طیب صاحب سے پوچھا کہ عصر کا وقت ہو گیا؟ اسی طرح دو مرتبہ دن میں اور بھی پوچھا، بالآخر ۲۴ فروری ۲۰۱۱ء بروز جمعرات کو یہی آیت مبارکہ تلاوت کرتے ہوئے عصر کے وقت اپنے خالق حقیقی سے جا ملے انا اللّٰہ و انا الیہ راجعون ہر آنکھ اشکبار تھی لوگ ایک دوسرے سے مل کر رو رہے تھے اور تسلیاں دے رہے تھے، محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ۴۰ ہزار افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی، جنازہ کا منظر دیدنی تھا لوگ پروانہ وار فدا ہو رہے تھے اور ہر ایک خود کو استاذ جی کا وارث سمجھ رہا تھا، نماز جنازہ استاذی حضرت اقدس مولانا مفتی محمد طیب سلیم صاحب مدظلہم نے پڑھائی۔

حضرت نے اپنے پسماندگان میں ۳ بیٹے، ۴ بیٹیاں اور ہزاروں متعلقین کو سوگوار چھوڑا، آپ کے وصال کے بعد ہر ایک کی زبان پر یہ جملہ تھا کہ استاذ جی کو مجھ سے سب سے زیادہ محبت تھی، استاذ جی کے وصال کے بعد اب ان کی باتوں سے اور ان کے تذکرہ سے ایمان میں ترقی اور دل کو سکون حاصل ہوتا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ شعر جو انہوں نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارہ کہا تھا بار بار ذہن میں گردش کرتا ہے کہ

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ

ھو المسك ما کررته يتضوع

ہمارے نعمان (امام ابوحنیفہ) کا ذکر بار بار کرو، اس لیے کہ ان کا ذکر کستوری کی مثل ہے کہ جتنا اس کو رگڑا جائے اتنی ہی اس کی خوشبو پھیلتی ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ استاذ جی کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے اور آپ کے فیوض و برکات کو قیامت تک جاری رکھے اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

شہید

حسرت فقط شہید کرے گا بہشت میں
پھر بھیج اے خدا مجھے دنیائے زشت میں
جو لطف وقتِ مرگ تری راہ میں ملا
حورانِ جنتی میں نہ گلزار وکشت میں
یاں ہو نہ ہو، ہے خونِ شہیداں بہا ہوا
مہکِ گلاب ومشک ہے ہر سنگ وخشت میں
گر فتح بھی ظفر ہے، شہادت بھی ہے ظفر
غازی شکست ہے ہی نہ تیری نوشت میں
مغلوبِ کفر ہوگا نہ اسلامِ ذی وقار
قدرت نے اوج رکھا ہے اس کی سرشت میں
معمور ہوں گے نور سے ظلمت کدے سبھی
اسمِ حبیب گونجے گا دیر وکنشت میں
چاہے فہیم اور وہ قسامِ کل سے کیا؟
قربِ نبی جسے ہو میسر بہشت میں